مکمل ناول

آسیہ مرزا

جو رستہ دل سے نکلے

اس نے بیگ میں ٹھونسنے کے انداز میں کپڑے بھرتے ہوئے پلٹ کر اس پر نگاہ ڈالی جو ہنوز آنکھوں پر بازو دھرے یوں پڑا تھا۔ جیسے گہری نیند میں ہو مگر وہ گہری نیند میں تو کیا کچی نیند میں بھی نہیں تھا۔ ابھی تو اس کی ساری خوش فہمیوں کی چادر کا ٹانکا ٹانکا ادھیڑ دیا تھا۔

اس کے پہلو سے جیسے کوئی تلاطم خیز لہر اٹھی تھی مگر پھر اندر ہی کہیں دم توڑ گئی۔ جیسے سمندر کی بپھری ہوئی موج ساحل پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے اب اس سے الجھنے کا فائدہ نہیں تھا۔ اس نے جان ہی لیا تھا کہ اس کی ذات کے گرد اونچی اونچی فصیلیں ہیں جسے وہ نہیں پھلانگ سکتی تھی۔

"مجھے اب کہیں جا کر اس گھر میں اپنے مقام کا پتا چلا ہے دانیال آفریدی کہ۔ میں صرف اور صرف تمہارے بچوں کی آیا ہوں گورنس ہوں اینڈ نتھنگ۔"

وہ کپڑوں کے بعد ضرورت کی چھوٹی موٹی دوسری چیزیں بھی بیگ میں بھرنے لگی۔ پھر اس پر ایک مغموم نگاہ ڈالی وہ کم گو ضرور تھا۔ مگر اتنا بھی نہیں جتنا آج ظاہر کر رہا تھا یا پھر شاید یہ بے حسی کی انتہا تھی۔ اس کا دل سینے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا۔

"ڈرائیور موجود ہے، تمہیں چھوڑ آئے گا۔" اس نے جب بیگ کندھے پر ڈالا۔ تو وہ اطمینان سے سگریٹ سلگاتا ہوا اس کی طرف متوجہ تھا۔

"اور سنو یہ فیصلہ تمہارا اپنا ہے واپس آنے کا فیصلہ بھی میں تمہارے ہاتھ میں رکھتا ہوں' میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔"

وہ اس عنایت پر اسے تمغۂ احسان مندی تو ہرگز نہیں پہنا سکتی تھی۔ اپنے تئیں وہ عنایتوں کی بارش ہی کر رہا تھا۔ مگر اب وہ ایسی برساتوں میں بھیگ کر عاجز آ چکی تھی۔

وہ اپنے اندر غصے اور غم کے ابال کو کنٹرول کرتی باہر نکل گئی۔

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا بتاؤ کیسا لگا
تم اگلے زخموں کو چھوڑو یہ گھاؤ کیسا لگا
عجب سوال کیا آندھیوں نے پتوں سے
شجر سے ٹوٹ کر گرنا بتاؤ کیسا لگا

دروازہ مریم نے کھولا تھا اور اسے موٹے بھرے بھرے بیگ کے ہمراہ دیکھ کر لحہ بھر گنگ رہ گئی۔ پھر جیسے گہری سانس بھر کر ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

دوپہر کے کھانے کے لیے دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ وہیں سے مریم نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ خالہ اور مرتضیٰ بھی موجود تھے۔

اس نے کسی کو نہ دیکھا بیگ وہیں پٹخ کر اندر اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

"خدا خیر کرے، بچی اس طرح کیوں آ گئی ہے۔؟" خالہ نے دہل کر امی کی طرف دیکھا۔ جو خود بھی تشویش سے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔

"دیکھتی ہوں۔ اللہ جانے کیا ہو گیا۔"

"رہنے دیں امی! انہوں نے اندر سے لاک لگا دیا ہو گا۔" مریم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی اور یونہی نظر مرتضیٰ پر ڈالی جس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ پھر اٹھ کر بیسن پر جا کر ہاتھ دھونے لگا۔

"دروازہ بند کیوں کر لیا ہے۔" امی گویا مزید پریشان ہو گئیں۔ سب ہی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور مریم جانتی تھی اب کوئی نہیں کھائے گا سو برتن سمیٹنے لگی۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔؟" امی نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔

"اس "کیوں" کا جواب تو وہی دے سکتی ہے میں تو نہیں۔ مجھ سے کون سا پوچھ کر وہ فیصلے کرتی رہی ہے نہ میں اس کی پرسنل سیکریٹری رہی ہوں۔"

امی نے اس پر کھا جانے والی نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگیں کہ خالہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میمونہ! میں چلتی ہوں، میری موجودگی میں ابھی کچھ پوچھنا مناسب نہیں ہے۔" انہوں نے دزدیدہ نظر بیٹے پر ڈالی جو خود کو انجان اور بے پروا ظاہر کرنے کے لیے اخبار اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے کے زاویوں میں ہلکا سا کھنچاؤ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ کوئی کرے نہ کرے مریم واضح طور پر محسوس کر رہی تھی شاید اس لیے کہ اس کی توجہ اسی پر ہو گئی تھی۔ جانے کیوں وہ اس کے تاثرات لاشعوری طور پر جانچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

خالہ مرتضیٰ کے ساتھ چلی گئیں اور مریم کچن سمیٹنے لگی۔

"کیا کروں مریم! اس سے کہو دروازہ تو کھولے۔ کہیں دانیال سے لڑ جھگڑ کر تو نہیں آ گئی۔" امی کچن کے پاس آ کر کہہ رہی تھیں۔ وہ کولر میں ابلا ہوا پانی ڈالتے ہوئے آزردگی سے ہنس پڑی۔

"تو کیا اب بھی آپ کو شک ہے۔ اس بڑے بنگلے میں اور ہے ہی کون جس سے وہ لڑ سکتی ہے، جائیں شاید دروازہ کھول ہی دے، یوں بھی یہاں تک تو آ ہی گئی ہے۔ کسی کندھے کی طلب میں اور ایک ماں سے زیادہ مہربان غم سمیٹنے والا کندھا اور کس کا ہو سکتا ہے۔" اس نے جیسے امی کو اجازت دی اور امی بھی تشویش کے ساتھ چل دیں۔

"اپنی شکست کے اعتراف کے لیے بہت حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے امی۔ (شاید آپی بھی حوصلے جمع کر رہی ہوں گی)"

وہ پتیلا وہیں رکھ کر چوکی پر مغموم سی بیٹھ گئی۔ اسے تو اس کا یوں اجاڑ ویران چہرے کے ساتھ گھر آ جانا ہی سب کچھ سمجھا گیا تھا اور یوں بھی ایسے اندیشے تو پہلے ہی اس کے دل میں دھڑکتے رہتے تھے۔

"اسے اپنے بہنوئی دانیال آفریدی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ نہ اس میں کوئی خامی تھی وہ ایک مکمل مرد تھا۔ کئی خوبیوں سے آراستہ مگر بس "آپی" کے لیے نہیں بنا تھا۔"

اس نے ایک گہری مضمحل سے سانس سینے سے

خارج کی، دل کا تعلق تمام تر جذبوں اور احساسات سے ہوتا ہے جذبے نہ ہوں، احساسات برف ہو جائیں تو دل بنجر، بے آب و گیاہ صحرا کی مانند ہو جاتا ہے اور پتا نہیں آپی نے ایک جذبوں سے پر، احساسات سے سجے سرسبز و شاداب دل کو چھوڑ کر اس صحرا جیسے دل کو کیوں چنا۔ ایسے سودے میں تو خسارہ ہی خسارہ ہوتا ہے۔ مگر ندا عثمان سمجھ سکتی تو؟

♥ ♡ ♡ ♥

امی نے بالآخر دروازہ کھلوا لیا تھا اور اب وہ امی کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

"وہ مجھے صرف اور صرف اس گھر میں اپنے بچوں کی آیا بنا کر لایا ہے امی۔ اس کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا محور اس کا بزنس اور اس کے بچے ہیں۔ جس کے گرد وہ گھومتا رہتا ہے۔ میں تو اس کی زندگی کے آسمان پر بھٹکنے والا حقیر ذرہ ہوں، خود بکھرنے والا اور خود ہی سمٹنے والا۔"

امی نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ ماں تھیں، کیسے کہتیں کہ "ندا یہ فیصلہ بھی تو تمہارا تھا۔ کتنا روکا تھا مریم نے بھی آہ مگر جذبات میں سوچ کے پہلو کہاں ہوتے ہیں۔"

امی نے مریم سے کہا تھا، اب تم اسے سمجھاؤ کہ وہ ٹھنڈے دل اور عقل سے سوچے کہ اب اس طرح لڑ جھگڑ کر چلے آنا مناسب نہیں ہے یوں بھی جس طرح بھاگی ہوئی لڑکی کے واپسی کے قدم ماں باپ پر بھاری ہوتے ہیں، اسی طرح شادی شدہ لڑکی کے جھگڑ کر میکے چلے آنے والے قدموں میں بھی مضبوطی نہیں ہوتی۔

وہ بوجھ نہیں تھی مگر لوگوں کی اٹھتی انگلیوں اور کھلنے والی زبانوں کے بند ٹوٹ جاتے ایک بار تو پھر اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا تھا اور امی تو یوں بھی تنہا تھیں۔ شوہر اتنی دور شارجہ میں تھا اور وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"مریم۔" وہ دریچے میں کھڑی اندھیرے کو یوں گھورے جا رہی تھی۔ جیسے اب یہی کرنے کو رہ گیا ہو۔ مریم کا تسلی آمیز ہاتھ کندھے پر محسوس کر کے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

"مریم! کیا بچھڑنے والوں کے نقوش اتنے انمٹ بھی ہو سکتے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے۔ کیا وہ محض میری خوش فہمیاں تھیں کہ میں اپنے حسن، اپنے رویوں اور طریقوں تدبیروں سے اسے اپنا اسیر کر لوں گی۔ مریم، مریم وہ عورت تو اتنی عام سی تھی اتنی عام سی کہ وہ موجود بھی ہوتی تو کوئی اس کے لیے یوں اوف۔" وہ پلٹی۔

"مریم مرنے کے بعد بھی وہ اس کے وجود کے ہر حصے میں دھڑک رہی ہے۔ میری جگہ تو کہیں بھی نہیں ہے مریم۔" وہ مریم کی مہربان نظروں کو پا کر اپنی دل گرفتگی عیاں کر بیٹھی۔

مریم نے ایک گہری قدرے افسردہ سی سانس بھر کر کھڑکی کے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھا اور کسی لرزتے سائے کی طرح اس کی آواز ابھری۔

"ہر شخص کا معیار حسن مختلف ہوتا ہے آپی! جسے چاہتا ہے وہ اسے دنیا کی حسین ترین شکل دکھائی دیتی ہے اس طرح نہ ہوتا تو قیس نے لیلیٰ کو نہ چاہا ہوتا، جو رات کی مانند تھی یقیناً" اسے دن کے اجالوں اور چاند کی چاندنی کی طرح دکھائی دیتی ہو گی۔ حسن تو آنکھ میں ہوتا ہے، دل میں سمٹا ہوتا ہے۔"

اور ندا اضطراری انداز میں انگلیاں مسلتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر بے آواز رو دی۔

"ہاں مریم! ہاں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رابعہ ہی رابعہ ہے میں کیسے نظر آؤں گی، بظاہر اس کے قریب ہوں مگر بہت دور دکھائی دیتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے مریم! مجھے سزا ملی ہے۔ مرتضیٰ حسن کا دل توڑنے کی۔" مریم نے شدت کرب سے ہونٹ بھینچ کر چہرے کا رخ موڑ لیا۔ ہاں جذبوں، تمناؤں، خوابوں سے بھرا دل تو اور بھی نازک ہوتا ہے ذرا سی ٹھیس پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے مرتضیٰ حسن کی کوئی آہ آسمان سے ٹکرائی ہو۔

رات بھر کی بے خوابی اور متواتر گریہ وزاری نے اسے اتنا مضمحل ــ اور تھکا ڈالا تھا کہ مریم نے اسے سمجھانے کا ــ ارادہ ترک کر کے اسے دودھ میں نیند کی گولی گھول کر پلا دی اور پھر اسے کچھ دیر بعد غنودگی

میں جاتے دیکھ کر باہر آ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز کالج سے نکلی تو ٹھٹک گئی۔ مرتضیٰ اپنی بائیک لیے کھڑا تھا۔ وہ بھی مریم کو دیکھ چکا تھا' ہاتھ ہلا کر اسے اشارا دیا۔

"آپ خیریت۔" وہ قدرے حیران پریشان اس طرف چلی آئیں۔

"آؤ بیٹھو' کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔" وہ بائیک پر پوزیشن سنبھال کر بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھ گئی۔

وہ جانتی تھی وہ کیا بات کرنا چاہتا تھا اس سے' بلیک ٹراؤزر اور وائٹ شرٹ میں وہ اپنے دراز قد کے ساتھ اس کے آگے پھیل کر بیٹھا تھا' وہ جیسے پیچھے پوری چھپ گئی۔

ایک پارک پر اس نے بائیک روکی۔

"تم اتنی سمجھدار ہو مریم کہ میرا خیال ہے تمہیں ازخود سمجھ لینا چاہیے کہ میں تم سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھ دار ہوں۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔ "اپنی اس خوبی کی مجھے تو خبر نہیں۔"

"مگر مجھے تو ہے نا۔" وہ بائیک سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر جانے کیوں پلکوں کی لرزتی چلمن گرادی۔

"اور کیا خبر ہے آپ کو۔" اس کا دل پہلو میں مچل مچل کر دھڑکنے لگا۔

"ندا نے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت تو نہیں کر ڈالی' میرا مطلب ہے پھر کوئی ضدی اکھڑ سا فیصلہ۔" وہ بے قراری اور تشویش کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے مرتضیٰ حسن کہ جو کسی دل کے ایک گوشے میں رہ جائے۔ پھر وہ کسی اور کے وجود سے پوری نہیں ہوتی جو چہرہ' ذہن و دل کے طاقچوں میں ایک بار سج جائے وہ نہیں مٹتا۔" اس کی آواز میں لرزش سی تھی ایک دل گرفتگی تھی اور نگاہیں۔ ایک اونچے اور گھنے درخت کے بے رونق تنے پر جمی تھیں' اس کی آنکھوں کے پار دھند کی ہلکی سی تہہ تھی۔ مرتضیٰ اسے چند ثانیے دیکھتا رہا۔

دھوپ کی تمازت اس کے رخساروں کو چھو کر اسے لال بھبھوکا کر رہی تھی۔ آنکھوں کے اوپر پیشانی تک دوپٹے کا چھجا سا تھا مگر اس کے باوجود وہ گل نار تھی وہ یکدم اضطراب کا شکار ہو کر اپنی جگہ سے ہٹ کر بینچ کے پیچھے لگے درخت کی طرف بڑھ گیا اور بادام کے نئے اور نوخیز سرخ سرخ پتوں کو نوچنے لگا۔

"کیا دانیال آفریدی نے اسے خود گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔" کئی لمحے توقف کے بعد اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں استفسار کیا۔

"نہیں۔ انہوں نے تو آپی کے لیے واپسی کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔"

"تو پھر وہ کیوں حماقت کا ثبوت دے کر چلی آئیں۔" وہ تڑپ کر پلٹا۔ مریم نے سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھے بیٹھے ذرا سا پلٹ کر اسے دیکھا۔

"یہ بات اسے امی اور میں سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں مرتضیٰ! اب اسے آپ سمجھائیں کہ وہ کیوں اپنے آباد گھر کو اجاڑنے کے درپے ہے۔ ضروری تو نہیں کہ جسے چاہا جائے' اسے پا بھی لیا جائے۔ کیا یہ بہت نہیں ہے کہ جسے چاہا وہ نگاہوں کے سامنے ہے بھلا کوئی کسی کے دل میں زبردستی گھر کر سکتا ہے۔" اس کا لہجہ دھیما ہو گیا پھر بے قراری سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"دانیال بھائی تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وہ نادانی میں خسارے کا سودا کر رہی ہے' وہ صرف بچوں کی خاطر اس سے شادی پر آمادہ ہوئے تھے۔ مگر تب آپی نے یہی غنیمت جانا تھا۔ مگر اب ان کے تقاضے بڑھ گئے ہیں۔ مگر دانیال بھائی ہنوز اسی جگہ کھڑے ہیں۔" وہ رومال سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ پھر اس کے پاس آئی جو جوتے کی نوک سے زمین پر بے مقصد لکیریں کھینچ رہا تھا۔

ایک ہرے بھرے سرسبز شجر کی چھاؤں کو چھوڑ کر وہ ایک بے آباد بنجر درخت کے سائے کے پیچھے دوڑ گئیں' یہ تو ہونا تھا۔

ہر آدمی کی چھاؤں مختلف ہوتی ہے ضروری تو نہیں اس کی چھاؤں سب کے لیے یکساں ہو اور سب کے

لیے ہو۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ اسے دیکھو جو تمہاری طرف دیکھتا ہے۔ اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے' اس کی سنو جو تمہاری سنتا ہے اور اپنا ہاتھ اسے دو جو تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہے۔ آہ مگر آپی یہ بات کبھی نہیں سمجھ پائیں' اور جب سمجھ آنے لگی تو وقت بہت گزر چکا ہے۔ سب کچھ کھو دینے کے بعد صرف ملال کی اذیت ہی حصے میں آتی ہے۔

"پلیز اب چلیں۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ پلٹ کر قدم اٹھاتی بائیک کی طرف چلی آئی۔

مرتضیٰ نے ایک گہری سانس سینے کی تہہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی۔

ایک ہی درخت کی یہ دونوں ڈالیاں کس قدر مختلف تھیں۔ اس نے دوپہر کی گرمی جھیلتے پارک پر دور تک نگاہیں ڈالیں۔ جیسے اس کے دل کا سناٹا باہر تک پھیل گیا ہو۔ وہ بائیک کے قریب آیا۔

تو ندا عثمان! تمہاری تمناؤں کا جال بالآخر ٹوٹ گیا۔ تمہارے دعوے غلط ثابت ہوئے اور تم نے شکست کو قبول کر لیا۔

مگر میں نے تمہیں کبھی بددعا نہیں دی کہ میرے نزدیک تم غلط نہیں تھیں' ہر شخص اپنی خواہشوں کی تکمیل اور خوابوں کے حصول کی تگ و دو کرنے میں آزاد ہے اور مریم ٹھیک کہتی ہے بھلا کسی کے دل میں زبردستی گھر کر سکتے ہیں؟۔"

وہ بائیک خالی سڑک پر فراٹے سے بھگانے لگا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"راہ شوق میں اٹھا ہوا کوئی بھی جذباتی قدم ہمیشہ کے لیے نا آسودگیاں جھولی میں ڈال جاتا ہے۔ آپی! ایسی بازی لڑکیاں ہار جایا کرتی ہیں' تم ہوش کے ناخن لو' ابھی وقت ہے' پاگل مت بنو۔" مریم نے تب بھی اسے بہت سمجھایا تھا۔

مگر اس پر تو دانیال آفریدی' اس کی امارت' اس کی لمبی سی نئے ماڈل کی کار' اس کا محل جیسا گھر اور خود اس کی سحر انگیز شخصیت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔

یوں بھی وہ مریم سے دو سال بڑی ہونے کے باوجود اس سے کم عقل' جذباتی' غصیلی اور ضدی لڑکی تھی۔

"دو بچوں کے باپ سے محبت کرنے کی کیا تک ہے آپی۔" اس نے ہنس کر طنز کیا تھا مگر وہ بے پروائی سے ہنس پڑی۔

ناصر پبلیکیشنز کی جانب سے
ڈاکٹر بشیر بدر کی دو کتابوں کے ڈیلکس ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں۔
• کوئی شام گھر بھی رہا کرو
خوبصورت غزلوں کا انتخاب
قیمت صرف -/١٠٠ روپے
• کلیات بشیر بدر
ڈیلکس ایڈیشن
قیمت -/350 روپے
تحفے میں دینے کے لیے خوبصورت ایڈیشن
آج ہی اچھے بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ڈاک سے منگوانے کے لیے منی آرڈر ارسال کریں۔
ڈاک خرچ اور پیکنگ فری۔
سول ڈسٹری بیوٹر
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
٣٧، اردو بازار کراچی

"محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے مریم۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، بس پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے جب بھی اس شخص کے قدم میری طرف اٹھتے ہیں مجھے اپنی رگ رگ میں صرف دل دھڑکتا سنائی دیتا ہے، میری بصارتیں سماعتیں سب دل بن جاتی ہیں اور دھڑکنے لگتی ہیں ہاں مریم کیا یہ محبت نہیں ہے۔"

"اس کے قدم تمہاری طرف نہیں، اپنے بچوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ اسکول میں اپنے بچوں سے ملنے آتا ہے اور تم سے بچوں کی بابت ہمکلام ہوتا ہے، اور اب یہ خوامخواہ کی دردسری پال لی ٹیوشن پڑھانے کی، اس کے بنگلے پر جا کر اس کے بچوں کو ٹیوشن دینا۔ اونہہ خوامخواہ کی خواری۔ کب عقل آئے گی آپی تمہیں۔"

اور جواباً" ندا اسے خشمگیں نظروں سے دیکھ کر استری کا پلگ نکال کر استری اور اپنے کپڑے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی مریم نے سر تھام لیا۔

دو بچوں کا باپ دانیال آفریدی جانے کب، کیسے ندا عثمان کے خیالات اور احساسات پر چھاتا چلا گیا، شاید اس روز جب بہت تیز بارش میں وہ اسکول سے نکلی تو۔ وہ اپنے بچوں کو پک کرنے آیا تھا۔ بچوں نے شور مچایا۔

"ہماری مس، ہماری مس۔" اس نے بچوں کی بھیگتی مس کو دیکھا اور مروتاً" آفر کر دی۔ ایک تو مسحور کن شخص اس پر خوب صورت نئے ماڈل کی گاڑی۔ گاڑی کی فضا میں خنک ہوائیں اور اس کے وجود سے اٹھتی پرفیوم کی مہک۔

ندا عثمان کی رگوں میں مچلتے لہو میں یہ سارا کا سارا سحر گھلنے لگا۔

چھوٹی چھوٹی خواہشات کے آگے وہ یوں بھی تنکے کی طرح بہہ جانے والی لڑکی تھی۔ یہ تو برسوں سے تعمیر ہوئے خواب تھے۔

"تھینک یو۔" وہ گھر کے سامنے اتر کر ممنونیت کے احساس کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، آپ میرے بچوں کی استاد ہیں، ایک طرح سے میرا فرض بنتا تھا۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ڈرائیور روز ہی بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کرتا ہے اور اسی روڈ سے گزرتا ہے۔ آپ کو بھی پک اینڈ ڈراپ کر لیا کرے گا۔" اس نے نرمی اور خلوص سے اسے آفر دی۔

"یوں بھی میرے بچے آپ کے بہت فین ہیں، مس ندا عثمان ہیں نا شاید آپ۔" اس نے اپنی سنہری آنکھوں سے گلاسز اتار کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تو اس نے فرنٹ سیٹ پر اس کے دونوں گورے چٹے بچوں کو دیکھا اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

"آپ کے بچے بھی بہت پیارے ہیں۔ آپ اندر آیئے نا۔" اسے اچانک خیال آیا۔ مگر اس نے معذرت کر دی۔

"پھر کبھی سہی۔ آپ صبح تیار رہیے گا۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ آئیں گے لینے؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی مگر دوسرے پل شرمندہ سی ہو گئی۔ مگر وہاں تر اسکون تھا۔

"میں تو صبح آفس جاتا ہوں۔ بس آج بارش کے باعث چھٹی کر لی۔ او کے۔" وہ گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ ندا عثمان کن من کن من برستی بوندوں میں بھیگتی عجیب سے نامانوس سحر میں جانے کتنی دیر گرفتار رہتی۔ مریم نے دروازہ کھول کر اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"مرتضیٰ کا کیا کرو گی آپی۔" مریم اس کے بڑھتے جنون سے گھبرا کر پوچھنے لگی۔

"اچار ڈالوں گی۔" وہ کاپیاں چیک کرتے کرتے غرائی تو مریم باوجود چڑنے کے ہنس پڑی۔

"بڑا مزے دار اچار ہو گا، جذبوں سے پر، چاہتوں کے مسالوں سے بھرا ہوا، پھر سیر ہو کر صبح و شام کھاتی رہنا۔"

اور اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس پر اپنی ربڑ کی چپل کھینچ ماری جو سیدھی اس کے نرم گداز بازو کو گرم کر گئی۔

"تم کھا سکتی ہو صبح و شام یہ اچار۔ میری طرف سے اجازت ہے جذبوں سے پُر۔"

"آپی۔" مریم یکدم سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"کیا صرف اس کا شاندار گھر، گاڑی پیسے پر پھسل گئی ہو؟۔"

اس کا خیال تھا وہ بھڑک اٹھے گی مگر وہاں ٹھہراؤ تھا۔ اس نے کاپی بند کی اور اس کے گتے پر لکھے نام پر اپنا قلم پھیرنے لگی۔

"ٹھیک ہے دولت بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں آپی۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم یہ طبقہ مکمل آسودہ ہوتا۔ کوئی دکھ کوئی غم انہیں نہ ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے دکھ سکھ کا تعلق دولت سے نہیں ہے۔"

"میں بھی مانتی ہوں، دولت سب کچھ نہیں مگر ہم جیسی ناآسودہ اور مڈل کلاس لڑکیوں کے لیے سب کچھ ہی ہے، بہرکیف میں اس کی امارت پر نہیں ریجھی ہوں یقین کرو۔ اس میں کوئی ایسا سحر ہے جو مجھے جکڑے ہوئے ہے، میں نے اسے پہلی بار دیکھا، اس سے باتیں کیں پھر دوسری بار اور پھر دل چاہنے لگا اسے بار بار دیکھوں۔" وہ دانیال آفریدی کے مہکتے خیال میں کھونے لگی، مریم نے اس کی دیوانگی پر اسے کرب سے دیکھا۔

"ہو سکتا ہے مرتضیٰ بھائی، بڑی سی گاڑی میں گھر آتے تو تمہیں ان میں بھی ایسا ہی سحر محسوس ہوتا۔" ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی تو۔ ندا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہیں اس کی اتنی فکر ہے تو تم کر لو اس سے شادی۔" اس نے جیسے جل کر کتابیں کاپیاں سمیٹیں، مریم کا دل پہلو میں لرز کر رہ گیا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں اور وہ اپنے چپل کی سیاہ پٹی پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

"بہرحال آپی! یہ خسارے کا سودا ہے، یہ آگ ہے جو تم اپنے اردگرد دہکا رہی ہو، جبکہ دانیال آفریدی تم میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا اور یہی بات تشویش ناک ہے آپی! یہ یکطرفہ سفر ہے۔ جس کی کوئی منزل نہیں ہے کہیں تم منزل تو کیا واپسی کے راستے بھی نہ کھو دو۔ یاد رکھو آپی، پا لینے کی خوشی سے کہیں زیادہ کھو دینے کی اذیت ہوتی ہے اور میں تمہیں اذیت کے اس پُرخار سفر پر چلتے دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"کیا کمی ہے مجھ میں، خوب صورت ہوں، پڑھی لکھی ہوں۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ہے، پھر وہ کب تک مجھ سے گریز کر سکتا ہے۔" وہ بے خوفی اور بے حیائی سے اکڑ کر بولی تو مریم نے اس پر فلسفیانہ نگاہ ڈالی اور گہری سانس بھر کر وہاں سے کھڑی ہو گئی۔

"اپنے مرتبے اور مقام سے اتنا مت گرو آپی، جو تمہیں خوشی عزت اور وقار کے ساتھ بیاہ کر لے جانا چاہتا ہے، اسے چھوڑ کر کسی پر زبردستی مسلط ہو کر کیوں اپنے مرتبے اور نظروں سے گرنا چاہتی ہو۔" وہ سارا دن آزردہ سی رہی۔

♥ ♡ ♡ ♥

فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سب ہی کو پیاری لگے

کسی نے قریب کرسی کے ہینڈل پر انگلیاں بجائیں تو اس نے گھٹنوں پر رکھا سر اوپر اٹھایا۔ بلو جینز اور وہائٹ شرٹ میں سادہ سی چپل پہنے ہمیشہ کی طرح لاپروا سے انداز میں مرتضیٰ حسن کھڑا تھا۔ وہ اب پہلے جیسا کھلنڈرا تو نہیں رہا تھا مگر لاپروا اب بھی تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے اس انداز پر چڑ کر کہتی تھی۔

"یہ جینز کے نیچے چپل پہننے کی کیا تک ہے مرتضیٰ بھائی! اور کبھی شلوار سوٹ کے نیچے جوتے۔" مگر آج اس کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔

"چائے ملے گی اسٹرونگ سی۔" اس کے سر اٹھانے پر وہ بولا اور وہیں موڑھا دیوار سے اٹھا کر اس پر بیٹھ کر دیوار سے پشت لگالی۔ انگلیوں میں بائیک کی چابی تھی۔

"آپ کب آئے۔؟" وہ اٹھتے ہوئے ذرا سا چونک کر بولی اور آنکھوں میں پھیلی نمی کی ہلکی سی دھند کو دوپٹے سے رگڑنے لگی۔

"بہت دیر ہوئی مگر تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔" اس کے لفظ جگانے پر وہ خفیف سی ہو گئی۔

"وہ بس یونہی آپی کے متعلق سوچ رہی تھی۔" وہ خوامخواہ ہی وضاحت کرنے لگی۔

"جانتا ہوں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے یوں بھی تمہیں اپنے سوا سب کے متعلق سوچنے کی بیماری

ہے۔" وہ خوشگواری سے اسے نگاہوں کے زاویے میں لیتا ہوا بولا۔ اس نے ذرا سا چونک کر جانے کس احساس کے تحت اسے دیکھا پھر خاموشی سے کچن کی طرف چلی آئی۔

"دانیال کی طرف سے کوئی خبر۔ میرا مطلب ہے اس نے فون کیا۔"

وہ اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا اور وہیں دروازے میں پورا پھیل کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ کیوں کرنے لگے فون۔ انہوں نے تو واپسی کا فیصلہ بھی آپی پر چھوڑا ہے۔ کیا یہ غنیمت نہیں ہے۔"

وہ صرف ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ بات تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔

"آپ نے مجھ سے کہا تھا آپی کو سمجھائیں گے۔" وہ فریج سے دودھ کا برتن نکال کر کیتلی میں ڈالتے ہوئے اسے یاد دلانے لگی۔ تو وہ ہنس پڑا۔

"میں سمجھاؤں۔" اس کا لہجہ جیسے خود پر ہنستا ہوا تھا۔ اس کی براؤن آنکھوں میں اپنے لیے ہی استہزا تھا مریم نے نظریں چرا لیں۔

"ویسے میں نے کب کہا تھا کہ سمجھاؤں گا۔ ہاں تم نے مجھ سے ضرور کہا تھا اور مریم عثمان! نصیحت کی عقل مندوں کو ضرورت نہیں ہوتی اور بے وقوف اسے قبول نہیں کرتے۔"

"تو آپ کے خیال میں آپی عقل مند ہیں یا بے وقوف۔" وہ اس کی بات پر محظوظ ہو کر ہولے سے مسکرائی تھی۔ اڑتی بھاپ کے پس منظر میں اس کے تپتے لال چہرے پر یہ بے ساختہ امڈنے والی مدھم سی مسکراہٹ خاصی خوب صورت محسوس ہوئی تھی۔

"عرصہ ہوا میں نے خیال ظاہر کرنا ترک کر دیا ہے یوں بھی یہ کوئی سائنسی فارمولا نہیں ہے کہ اس سے سب متفق ہی ہوں۔"

وہ فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس کے لیے یہاں وہاں نظریں دوڑانے لگا اس نے گلاس اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔

"تھینک یو۔ انکل کا فون آیا یا نہیں۔"

"آیا تو تھا پرسوں۔ مگر امی نے ان سے کچھ کہا نہیں۔ امی کا خیال ہے وہ اتنی دور بیٹھے ہیں۔ کچھ کر تو نہیں سکیں گے سوائے پریشان ہونے کے۔"

"آہ کہاں ہوتی ہیں ایسی وفادار، خیال رکھنے والی بیویاں اب۔" وہ خالہ کو سراہنے لگا وہ ہنس پڑی۔

"بیویاں؟ آپ نے کتنی بیویاں برت لی ہیں۔" وہ چائے کپ میں ڈال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ جس پر وہ کچھ جھینپ سا گیا پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

ایک کے ہی خواب دیکھے تھے وہ بھی۔

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

"چلو یونہی سہی۔" وہ تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ مریم کے اندر چھن سے جیسے کچھ ٹوٹ گیا ایک کرب آمیز احساس روح پر آبلے کی طرح پڑا اور ٹپکنے لگا۔

یکدم اس کے چہرے کے نقوش میں عجیب سا حزن سمٹ آیا۔ وہ سر جھکا کر سلیب پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔

"سنو مریم۔" وہ بھاپ اڑاتی چائے پر نگاہیں جمائے مریم سے ہی مخاطب تھا۔

"اگر تم یا خالہ اجازت دو تو میں۔ دانیال سے خود بات کروں۔"

"کیا بات کریں گے۔" وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو لحظہ بھر کو وہ بھی گڑبڑا گیا۔ پھر پُرخیال انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا۔

"یہی کہ وہ خود آ کر ندا کو منا کر لے جائے یوں بھی عزت دار گھرانوں کی لڑکیوں کو زیادہ دن میکے میں نہیں رہنا چاہیے۔" وہ بولتے بولتے یکدم چپ ہو گیا۔ وہ سرخ تنتے چہرے کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی اس کی نظریں مرتضیٰ پر تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں یا کسی کو بھی اس شخص کے پاس جا کر منت سماجت کرنے کی۔ پہلے ہی میں اپنے مرتبے اور حیثیت سے گر چکی ہوں بہت ذلیل ہو چکی ہوں۔ مجھے اتنا بے وقار اور ذلیل مت

کرو۔ مت کرو تم سب مل کر مجھے اتنا بے توقیر۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

مریم نے کرب سے لب بھینچ لیے۔ جبکہ مرتضیٰ اپنی جگہ سناٹے میں رہ گیا۔

پھر مریم ہی اس کی طرف بڑھی۔

"آپی آپی پلیز کوئی نہیں جا رہا ہے۔ دانیال بھائی کی طرف، وہ تو صرف مشورہ کر رہے تھے۔ جا تو نہیں رہے۔" وہ اسے تھام کر واپس کمرے میں لے گئی۔ شکر تھا امی اس وقت گھر پر نہیں تھیں ورنہ دونوں ماں بیٹی رونے لگتیں تو مریم اکیلی ہراساں ہو جاتی۔ دونوں کو سنبھالنا ہی مشکل ہو جاتا۔

"مریم! میں اس گھر میں اب کبھی نہیں جاؤں گی جب تک میری حیثیت کا تعین نہیں ہو جاتا، جب تک مجھے وہ مقام نہیں ملتا جس کی میں حقدار ہوں میں اس شخص کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی مجھے نفرت ہے اس سے۔ اس شخص نے میرے سارے خواب بکھیر دیے۔"

وہ مریم کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور خود مریم کے اشک اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے پھر وہ یکدم اس سے الگ ہو کر بھیگی آنکھیں جھپک کر دروازے کے پاس آ کر کھڑے ہو جانے والے مرتضیٰ کو دیکھنے لگی۔

وہ کھلنڈرا لڑکا خاصا بدل چکا تھا۔ یکدم ہی بہت سنجیدہ، مضبوط اور باوقار سا لگنے لگا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی جو اسے ایک مکمل مرد ظاہر کر رہی تھی چہرے اور آنکھوں میں اس لمحے سنجیدگی کے ہمراہ اداسیاں بھی رقم ہو چکی تھیں۔ وہ ندا کو دیکھ کر اس وقت گہرے صدمے کا شکار ہوا تھا۔

جس کی ساری شاعری اس لڑکی کے لیے تھی ساری خوب صورت تشبیہات جس کے لیے تھیں وہ آج کس قدر اجاڑ، ویران اور مضمحل ـــ دکھائی دے رہی تھی۔ جو رنگ برنگے کپڑے پہنے تتلی کی طرح اس آنگن میں اڑتی پھرتی تھی۔ اب اس مجروح پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی، جس کے بال و پر نوچ دیے گئے ہوں۔ وہ اذیت اور کرب کا شکار ہو کر باہر نکل گیا تھا۔

"مریم! تم نے کہا تھا نا۔ پالینے کی خوشی سے زیادہ کھو دینے کی اذیت ہوتی ہے۔" وہ گہری سانس بھر کر وہیں تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے لہجے میں محرومیاں چیخ رہی تھیں۔ یہ محرومیاں آج مرتضیٰ کو دیکھ کر شدید ہو گئی تھیں یا پھر اپنے مستقبل کو باد صرصر کی مانند محسوس کر کے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کی جنوں خیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں، اسے تو اب سوتے جاگتے دانیال آفریدی کے خواب دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے دل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ اس کے بچوں کو سیڑھی بنا رہی تھی۔ انہیں گھر جا کر ٹیوشن پڑھاتی۔ نہ صرف پڑھاتی بلکہ کہانیاں سناتی، ان پر توجہ دیتی، چھوٹے موٹے گفٹس دیتی۔ ان کی باتوں کو غور سے سنتی، ان کی دکھائی چیزوں کو خوب سراہتی وہ بن ماں کے یہ بچے اتنی توجہ پا کر اس کے عاشق ہو گئے تھے، دن رات ان کے لبوں پر مس ندا کا ہی کلمہ ہوتا اور یہ بات دانیال آفریدی کے لیے تشویش کا باعث ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بچوں کو کہیں گھمانے لے جاتا تو وہ دونوں یک زبان ہو کر مس ندا کو ساتھ لے جانے کی فرمائش کرتے، رات کو انہیں سلاتا تو مس ندا کی طرح کہانیاں سنانے کی خواہش ظاہر کرتے، اور ان ہی کی طرح پیار کا مطالبہ کرتے، وہ سر پکڑ کر رہ جاتا۔

♥ ♡ ♡ ♥

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تیری آنکھوں کے سوا

وہ صحن میں آئی تو بے حد ترنگ میں تھی، نیلے جارجٹ کے حد سے زیادہ فٹنگ والے کپڑوں میں اس کا متناسب جسم ہیرے کی طرح دمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

مریم واشنگ مشین سے کپڑے نکال رہی تھی اس کی ترنگ بھری گنگناہٹ پر اس کی طرف متوجہ ہوئی

اور پھر کتنے پل دیکھتی رہی۔

یوں تو وہ آج کل ہر وقت ہی آراستہ پیراستہ رہنے لگی تھی۔ مگر آج اس کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔

"یہ شرٹ کی فٹنگ کچھ زیادہ ٹائٹ نہیں کردی آپی تم نے۔" مریم کے لہجے میں ہلکی ناگواری تھی' وہ بے پروائی سے باتوں میں میچنگ ہیر بینڈ لگاتے ہوئے بولی۔

"یہ بتاؤ! لگ کیسی رہی ہوں؟" وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے مریم ستائش کے ڈونگرے ہی برسادے گی۔

"جس کے لیے یہ اہتمام کیا ہے' اس سے پوچھ لینا۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھا کر نلکے کے پاس چلی گئی۔

"وہ تو تیرے جیسا ہے کٹھور اور بے درد' ایک نظر تک ڈالنا گوارا نہیں کرتا۔" وہ جھک کر اسٹریپ بند کرتے ہوئے قدرے دل گرفتگی کے ساتھ بولی۔

"تو فائدہ خود کو خوار کرنے کا۔"

"تم نہیں سمجھو گی ڈیئر! محبت میں انا نہیں ہوتی۔" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

"اچھا پہلی بار سنا ہے ویسے کون سی محبت' کہاں کی محبت' تم تو ٹھیک ٹھاک اس پر جال پھینک رہی ہو آپی! محبت تو خود دل سے پھوٹنے والا جذبہ ہے' جو دل کی زمین سے خود رو پودے کی طرح ابھرتا ہے' اور یوں بھی وہ شخص ایسی کیا اس سے اچھی محبت سے سیراب ہو چکا ہے' برت چکا ہے محبتوں کو' اس کے لیے تمہاری یہ ساری کوششیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔"

"او یو۔" وہ احساس تذلیل سے بھبھک اٹھی۔ قریب تھا کہ وہ مریم پر ہاتھ اٹھا دیتی۔ مگر اس کا ہاتھ پہلو میں مچل کر رہ گیا۔

شاید مریم کی استہزائیہ ہنسی اور اس کے ساتھ موجود اس کا اعتماد اسے اس اقدام سے روک گیا یا پھر اس رشتہ کا احترام جو دونوں کے مابین تھا۔

"تم میری بہن نہ ہوتیں نا تو میں تمہیں ٹھیک ٹھاک جواب دیتی۔" وہ بل کھا کر پلٹ گئی۔ اندر سے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور اس کی طرف دیکھے بنا کھٹ کھٹ سینڈل بجاتی گھر سے نکل گئی۔

وائٹ رائے کی تیز خوشبو خاصی دیر صحن میں محسوس ہوتی رہی۔ مریم کا دل سخت کبیدہ ہو گیا۔

"تم سمجھ رہی ہو' اپنے حسن کے جال' اداؤں اور نسوانیت کے زعم میں اسے اسیر کر لو گی ہر مرد' دل پھینک اور کمزور نفس نہیں ہوتا' اگر ایسا ہوتا تو ہر مرد بازاری عورتوں کی اداؤں پر فدا ہو جاتا' ان ہی کا اسیر ہوتا' اور گھریلو سیدھی سادی پاکیزہ بیویاں انہیں ایک آنکھ نہ بھاتیں مگر ایسا نہیں ہے۔ کوئی کوئی پتھر کو ہیرا سمجھتا ہے۔"

وہ اداس ملول سی نلکے کے قریب بنی پتھر کی چوکی پر بیٹھ گئی' اس کے ذہن کی رو مرتضیٰ حسن کی طرف اڑنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

دانیال آفریدی سٹنگ روم میں داخل ہوا تو وہ بچوں کو کہانی سنا رہی تھی' دونوں بچے قالین پر اس کے آس پاس اس کے زانو سے لگے بیٹھے تھے' جبکہ وہ خود مزے سے پشت پر دو کشن اور گود میں دو کشن دبائے بیٹھی ڈرامائی انداز میں کہانی سنا رہی تھی۔

"موٹا والا شیر کہتا ہے' شہزادی کو پہلے میں کھاؤں گا' جبکہ بڑا والا شیر کہتا ہے پہلے میرا حق بنتا ہے اور جیسے ہی بڑا شیر حملہ کرتا ہے اچانک ٹارزن ایک گھنے درخت کے تنے سے نکل کر دھاڑتا ہے۔"

"مس ندا! یہ کیا ہو رہا ہے؟" دانیال آفریدی کی آواز پر دونوں بچے یکدم گھبرائے۔ وہ بھی کچھ بوکھلا گئی پھر اچانک دونوں بچے ہنسنے لگے۔

"پاپا! آپ تو ٹارزن بن کر آ گئے۔ بالکل اچانک۔" وہ کچھ خفیف سا ہو گیا۔ جبکہ ندا سرعت سے کشن گود سے پھینک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ بچوں کو گھورنے لگا۔

"پاپا! مس ندا ہمیں شہزادی کی کہانی سنا رہی تھیں۔" فضا اٹھلا کر بولی۔ تو اس نے جواباً بچوں کو ایسی تیز نظروں سے گھورا کہ وہ دونوں سٹپٹا کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور اپنے اپنے بیگ اٹھا کر قالین پر بکھری کتابیں سمیٹ کر اس میں ٹھونسنے لگے اور پھر

دانیال آفریدی کے اشارے پر کمرے سے نکل گئے۔

"بیٹھیے مس ندا! مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے۔" وہ بچوں کے جانے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا' پھر نگاہیں ریک پر رکھے پیپر پر جما دیں۔

وہ چپ چاپ سی دھڑکتے دل کے ہمراہ شینل کے میرون صوفے پر ٹک گئی' پہلو میں دل مچلنے لگا' جیسے منہ زور لہریں ساحل کو بوکھلا کر رکھ دیتی ہیں' اسے لگا اس کے دل کے سمندر میں بھی تلاطم آ گیا ہو۔

"میں آپ کا بے حد ممنون ہوں مس ندا! کہ آپ میرے بچوں پر اتنی محنت کرتی ہیں' ان کے لیے اتنا وقت نکالتی ہیں۔"

بہت عام سے سادہ سے لفظوں میں تعریف تھی مگر اس نے حد سے زیادہ مسرت محسوس کی' اس کا چہرہ کھل اٹھا پھر دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی' وہ مزید بولنے کو لفظ تلاش کر رہا تھا شاید۔

گرے کلر کے شلوار سوٹ میں اس کا بے حد گورا رنگ اور دراز قد دل نشین لگ رہا تھا' سنہری آنکھوں پر سیاہی مائل سنہری پلکوں کا پہرہ تھا۔

سیاہی مائل ہونٹوں کو وہ بھینچے ہوئے تھا اس کے چہرے کی ساخت اور ناک کی بناوٹ اسے خاصا سنجیدہ اور ریزور سا ظاہر کر رہی تھی۔

"مس ندا! میں چاہتا ہوں کہ آپ بچوں کو اتنی توجہ نہ دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ سے اس قدر اٹیچ ہو جائیں کہ پھر کسی دوسری عورت کو قبول نہ کر سکیں۔"

"دوسری عورت۔" اس کے دل پر کھٹ سے پتھر آ لگا۔

"مم۔۔۔۔ میں سمجھی نہیں دانیال صاحب۔" وہ لرزیدہ قدموں کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ وہ ہنوز دوسری طرف دیکھ رہا تھا پھر اپنے ہلکے ہلکے سنہری روئیں والے مضبوط ہاتھ کی مٹھی بھینچتے ہوئے اس پر سادہ سی نظر ڈالی۔

"آفٹر آل' مجھے ایک دن شادی تو کرنا ہی ہے' میرے خاندان والوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے' میں بچوں کی خاطر یہ قربانی دینے پر مجبور ہوں' اور پھر آپ کو بھی ظاہر ہے۔ عمر بھر میرے بچوں کے ساتھ نہیں رہنا' کہیں بھی بیاہ کر جائیں گی۔"

"آپ کس سے شادی کر رہے ہیں؟" وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"کوئی بھی۔۔۔۔ ہو سکتی ہے۔" وہ بے تاثر لہجے میں مگر ملائمت سے بولا۔

"کوئی بھی تو وہ میں نہیں ہو سکتی کیا؟" اس نے ساری ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہہ دیا۔ دانیال آفریدی چونکا اور پھر قدرے تحیر آمیز بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا' مگر بجائے خفیف ہونے کے وہ پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی تھی۔

"وہ لڑکی میں بھی تو ہو سکتی ہوں دانیال صاحب۔"

"مس ندا۔۔۔۔ آ آپ اوہ وہ!" گہری سانس بھر کر یوں مسکرایا' جیسے کسی بچے کی نہایت بچکانہ بات سن لی ہو۔ ایک دو پل اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دو قدم چل کر صوفے کی پشت کی طرف چلا گیا۔

"میرا خیال ہے' آپ نے یہ بات بے سوچے سمجھے کہہ دی ہے۔ اینی وے' میں نے برا نہیں مانا۔" اس کا انداز سادہ اور قدرے پچکارنے والا تھا۔ ندا کے دل میں تیر پیوست ہو گیا۔

"میں مکمل ہوش و حواس میں ہوں دانیال صاحب! اور بے حد سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں' کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ۔"

"ندا بی بی۔" وہ یکدم سنجیدگی سے میں اسے مزید بولنے سے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "یقیناً" ہوش و حواس میں ہیں آپ' مگر سوچ سمجھ کر نہیں کہہ رہی ہیں' آپ جانتی ہیں میں دو بچوں کا باپ ہوں اور کتنا ایج ڈفرینس ہے ہم دونوں میں۔"

"میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" وہ دو بدو بولی پھر وہ قدرے خفیف سی ہو گئی۔ وہ خاصی ترش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سنہری آنکھوں کی تہوں میں غصے کی سرخی ابھر کر جمنے لگی تھی اور چہرے کے نقوش میں ناگواری جھلک آئی تھی۔

اس کی نرم ہتھیلیوں میں پسینہ پھوٹ نکلا' مگر وہ اب میدان میں کود ہی پڑی تھی تو شہسوار کو گرانا

چاہتی تھی وہ اپنے تمام تر ہتھیار آزما لینا چاہتی تھی۔ کئی لمحے کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ پھر وہ ہنکارا بھر کر اس کے قریب آیا۔

"تم ذرا وضاحت کرو گی کہ اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا تم نے۔ کس بات نے تمہارے اندر اس خواہش کو جنم دیا۔ اس نامعقول ــــ فیصلے پر روشنی ڈالنا پسند کرو گی۔" وہ اسے بغور جانچتے ہوئے بولا اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر تھیں جیسے وہ اس کے اندر کا حال جان لینا چاہتا ہو اس کے چہرے سے۔

اور ندا عثمان کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ ایک پل میں دو متضاد خیال اس کے ذہن میں آئے۔

آیا وہ صاف کہہ دے کہ میرے اس فیصلے کا پس منظر آپ کی ذات۔ آپ کا اسٹیٹس ہے۔

یا پھر وہ یہاں بھی بچوں کو سیڑھی بنائے اور اپنے دوسرے فیصلے کو مناسب خیال کرتے ہوئے وہ ابھی کچھ کہنا چاہ ہی رہی تھی کہ اس کی بھاری آواز ابھری۔

"پہلی بات تو یہ ہے مس ندا! کہ میں از خود شادی کا خواہش مند نہیں ہوں۔ مگر بچوں کی خاطر اور میرے خاندان والوں کے بڑھتے ہوئے اصرار نے مجھے عاجز کر دیا ہے۔ میرے اندر اب کوئی امنگ' کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں اپنی روٹین لائف سے مطمئن ہوں' مگر المیہ یہ ہے کہ لوگ مطمئن نہیں ہیں' سو یہ تلخ گھونٹ مجھے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے بھرنا پڑ رہا ہے اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ وہ کہاں سے اور کیسی لڑکی لاتے ہیں میرے لیے۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے بچوں کے لیے مخلص ہو۔ ایک منٹ۔" ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے کے لیے پر تولتا دیکھ کر ٹوک دیا۔

"مگر جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم میرے بچوں کی مس ہونے اور ان کی دوست ہونے کے ناتے میرے لیے قابل احترام ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم کسی ایسی الجھن میں پڑو۔ تم ابھی کم عمر ہو' خوب صورت ہو' اچھے گھر کی ہو' تمہارے لیے تمہارے جیسا ہی بھرپور' جذبوں سے پر' ولولہ انگیز ساتھی ہونا چاہیے۔ تمہاری عمر ابھی ایسے جھمیلوں میں پڑنے کی نہیں ہے'

میں تم سے صاف لفظوں میں کہتا ہوں' میرا دل اس مکان کی طرح ہے' جو باہر سے خوش نما ہے مگر اندر سے ویران ہے' اس میں داخل ہونے پر تمہیں سوائے ویرانیوں کے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ کوئی خوشی' کوئی امنگ' کوئی رونق نہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔"

اس نے اپنی بات کے اختتام پر اس پر سادہ سی نظر ڈالی جیسے استاد سوال سمجھانے کے بعد ــــــــــ شاگرد کو دیکھتا ہے مگر ندا عثمان اس نالائق شاگرد کی طرح تھی جو کہتے ہیں۔

"نو سر پلیز۔" اس نے یہ تو نہیں کہا۔ مگر ہٹ دھرمی سے بولی۔

"آپ سمجھ رہے ہیں' میں آپ کی ان ساری باتوں کے بعد اپنا فیصلہ بدل لوں گی۔"

"ہونا تو یہی چاہیے۔" وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں جھانک کر قدرے ترشی سے بولا جبکہ وہ دھیمے سے مسکرائی۔ پھر یکدم مسکراہٹ سمیٹ کر بولی۔

"مگر ایسا نہیں ہے میں فضا اور احمد سے اب دوری کا تصور بھی نہیں کر سکتی' دانیال صاحب! وہ مجھ سے مانوس ہوں نہ ہوں۔ میں ان سے اٹیچ ہو چکی ہوں' ایسا لگتا ہے جیسے اب میں کہیں اور سکھ نہیں پا سکوں گی۔" اس کے لہجے میں آزردگی تھی پھر یکدم صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بلک اٹھی۔

دانیال آفریدی کے لیے یہ سچویشن خاصی حیرانی اور پریشانی کا باعث تھی۔

"مس ندا! آپ رو کیوں رہی ہیں۔ پلیز' پلیز۔" وہ گھبرا کر یہاں وہاں پانی کا جگ تلاش کرنے لگا۔ پھر تیزی سے باہر گیا' ڈائننگ ٹیبل پر رکھی بوتل سے پانی بھر کر لے آیا۔

"اٹھیں پلیز اور یہ پی لیں۔"

"اگر اس کے ساتھ تھوڑا سا زہر بھی دے دیں تو زیادہ اچھا رہے گا سر۔" وہ سر اٹھا کر گلاس تھامتے ہوئے رندھی آواز میں بولی۔

تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ اونچا لمبا مرد سٹپٹا کر رہ گیا۔

اس نوبت کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بچوں سے زیادہ وہ بچوں کے باپ سے اس حد تک قریب ہو چکی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس کو کس طرح سمجھائے۔ وہ خالی گلاس میز پر رکھ کر ٹشو بکس سے ٹشو نکال کر ناک رگڑتے ہوئے بولی۔

"میں نے اب کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور سر اسے آپ میری جذباتیت سمجھیے گا۔"

اس نے اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔

"بات سنو۔" وہ ٹھہر گئی پہلو میں دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اس کے چہرے کے تنے نقوش ڈھیلے پڑ گئے تھے اور یہ اس کے لیے خوش آئند بات تھی۔

"تم اپنے فیصلے پر ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔"

"شکریہ۔" وہ تڑپ کر پلٹی "میرا خیال ہے غور آپ کیجیے گا' میں تو اپنی تمام کشتیاں جلا چکی ہوں" وہ یہ کہہ کر رکی نہیں اور سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔

باہر کی کھلی فضا میں نکل کر لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی' دانیال آفریدی کا اس کے رونے پر سٹپٹا جانا۔ اس کی آنکھوں سے سختی کا معدوم ہو جانا۔ اسے تو کم از کم اپنی منزل کی طرف جانے والے نشانوں کی طرح لگا تھا۔ اس کا خیال تھا تھوڑی محنت اور اچھی اداکاری سے وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکتی تھی۔

ان خوابوں کی تعبیر جو ایک عرصے سے اس کے دل میں پل رہے تھے' آنکھوں میں سلگ رہے تھے۔

عرصے سے وہ زندگی کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی اور اب اسے ان خوابوں کی تکمیل ہوتی نظر آ رہی تھی دانیال آفریدی کے روپ میں۔

اس نے بے حد مسرت کے ساتھ آج کے دن کی روداد اور اپنے تئیں کارنامہ مریم کے گوش گزار کیا تو

مریم کو گویا سکتہ سا ہو گیا۔ اسے حقیقتاً "ندا نے حیرت اور دکھ کے صدمے سے دوچار کیا تھا اور اسی حیرت کے دھچکے نے مریم کو کئی لمحوں تک کسی بھی رد عمل کے اظہار سے باز رکھا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے سر جھکائے بیڈ پر اپنے پیروں کے ناخنوں پر انگلی پھیر رہی تھی۔ اس کے رخسار دہک رہے تھے اور اس کی تپش کا اندازہ اسے اتنی دور سے بھی ہو رہا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہیں اور چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ جو کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے

باوجود دونوں کے نظریات کے اختلافات کے وہ اسے یہ سب بتانے پر مجبور بھی تھی اور مشتاق بھی رہتی تھی کہ امی تک اس کے احساسات پہنچانے کا فرض بہرحال مریم کو ہی ادا کرنا تھا۔

مریم نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بڑے دل نشین رنگ تیر رہے تھے جیسے اس نے دانیال آفریدی کو پا ہی لیا ہو۔

"مجھے یقین ہے' وہ میرے حق میں فیصلہ دے گا۔ وہ اپنے بچوں کو بہت چاہتا ہے اور بچے مجھے۔" وہ فاتح عالم بن کر مسکرائی۔

مریم نے اسے مجروح نگاہوں سے دیکھا۔ اسے اس کے چہرے پر پھیلا یہ عزم بے طرح دکھ دے رہا تھا۔

پتا نہیں انسان اتنی پستی میں اتر کر اتنا مسرور کیسے ہو سکتا ہے۔

"آپی! رفاقتیں وہی اچھی اور پائیدار ہوتی ہیں جو دل میں طلب بن کر ابھریں' پسندیدگی کے راستے سے ہو کر منزل پر پہنچیں۔ زبردستی اپنے خوابوں کی محض تکمیل اور تن آسودگی کے لیے دل کے تعلق نہیں جوڑے جاتے۔ اس میں محبت اور دوستی کی خوشبو نہیں ہوتی۔ یہ رفاقت جاں فزا نہیں ہوتی بلکہ اذیت بن جاتی ہے اور اس کے نتائج بڑے خطرناک نکلتے ہیں۔" مریم اپنے اندر کے اندیشے کو زبان پر لے آئی' اس کا لہجہ ناصحانہ تھا۔

جبکہ وہ سن کر تحقیر آمیز انداز میں مسکرا دی۔ عموماً"

جب کوئی بہت خلوص دل سے کسی کو سمجھانا چاہ رہا ہو تو اسے کچھ ایسی ہی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے آپ اس کے دشمن ہوں۔ اس کے ہمدرد نہیں حاسد ہوں اور وہ بھی مریم کو کینہ توز نگاہوں ــــ سے دیکھ رہی تھی مگر مریم کو پروا نہیں تھی وہ تو بس اس کا دامن اس آگ سے بچانا چاہ رہی تھی۔ جو وہ عالم دیوانگی میں اپنے چاروں طرف دہکا رہی تھی۔

"یہ سراسر حماقت ہے۔ نادانی ہے جو تم کرنے جا رہی ہو' تم شارٹ کٹ کے ذریعے آسودگیاں اور سارے خواب پالینے کی خواہش کر رہی ہو۔"

"شٹ اپ مریم۔ شٹ اپ۔" اس کا ضبط بالآخر جواب دے گیا۔ اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی جو آنکھوں میں بھی سمٹ آئی تھی۔

اگر مریم اسے سمجھانے اور اسے باز رکھنے کے بجائے اس کی کوششوں کو سراہتی' اس کے اس اقدام پر واہ واہ کر کے اس کا ساتھ دیتی تو وہ شاید بڑی عقیدت سے اس کا منہ چوم لیتی اور اپنی بربادی تک اسے ہی اپنا رہنما بنائے رکھتی۔

"ایک عرصے تک ایسے ڈائیلاگ مجھے متاثر کرتے رہے ہیں مگر اب میرے نزدیک ان کی اہمیت دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔ ــــ جب سامنے آسودگیاں دکھائی دے رہی ہوں تو غربت و افلاس کی طرف پلٹنا کہاں کی عقل مندی اور دانائی ہے' اور تم مجھے محض اس لیے مطعون کر رہی ہو کہ۔ مرتضیٰ سے بچپن سے مجھے منسوب کر کے مجھے پابہ زنجیر کر دیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہے' میں خود کو قطعاً" پابند نہیں سمجھتی' میرے نزدیک اس رشتے کی اہمیت کبھی نہیں تھی اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ بیڈ سے اٹھ گئی اور الماری سے اپنے کپڑے نکال کر صبح اسکول جانے کے کپڑے استری کرنے لگی' اس کا لہجہ قطعی بے لچک تھا۔ پتا نہیں اس میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل تھا۔

"بات مرتضیٰ بھائی کی نہیں ہے' بات تمہارے مستقبل کی ہے۔ جو ہوائی محل تم تعمیر کر رہی ہو۔ اس کے خوفناک نتائج کی ہے' جو شخص صرف بچوں کی خاطر تمہیں اپنائے گا اس کے گھر میں تمہارا کیا مقام ہو گا جانتی ہو گورنس۔"

"مریم۔" وہ بھبھک کر پلٹی۔ مریم تلخی سے ہنس دی۔

"یہی سچ ہے۔"

"کوئی سچ نہیں ہے۔ تم نجومی نہیں ہو کہ مستقبل کا حال ابھی سے جان گئیں۔" اس نے تڑخ کر سر جھٹکا پھر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"تم کتنی ہی کوشش کر لو' مجھے میرے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتیں۔" اس نے مریم کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"جانتی ہوں' مگر بہن ہونے کے ناتے تمہیں کسی تباہی سے خبردار کرنے کا حق تو رکھتی ہوں نا۔" وہ دل گرفتگی سے بولی تو لحظہ بھر ندا اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر گہری سانس بھر کر وہیں زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

کمرے کی فضا کتنی دیر بوجھل سی رہی۔ کئی لمحے گزرنے کے بعد ندا نے عجیب سی نظروں سے مریم کی طرف دیکھا' پھر اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی چمکنے لگی اور وہ مرتعش آواز میں بولی۔

"شاید اب تک میرے خوابوں کی دنیا' اس کا معیار یہی کچھ تھا تمہاری طرح پاکیزگی' عزت نفس' مگر پھر بہت سی محرومیوں نے میرے سوچنے کا انداز بدل ڈالا میرا معیار بدل ڈالا ہے۔ مریم! شرافت اور پاکیزگی کے بلند مینار پر کھڑے ہونے سے کبھی کوئی آپ کو سلام پیش نہیں کرے گا' کوئی آپ کی عظمت کے گن نہیں گائے گا۔"

"تو کیا اس مینار سے اتر کر پستی میں گر کر یہ مل جائے گا۔" وہ طنز سے ہنسی مگر حقیقتاً" اس میں طنز سے زیادہ دل گرفتگی تھی۔

"شاید۔" وہ بغیر برا مانے سر ہلانے لگی۔ "میں اب اپنے سارے نظریات' پاکیزگی کے سارے فلسفے' عزت نفس کی ساری کہانیاں ماضی کے سمندر میں غرق کر دینا چاہتی ہوں' امیر کبیر شوہر کی بیوی بن کر جینا چاہتی ہوں' میں ایک نئی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔

جس میں زندگی تھرکتی دکھائی دے۔ زندگی مجروح پرندے کی طرح نہیں بلکہ تتلی کی طرح رنگین دکھائی دے۔" اس کی آنکھوں میں سرخی گہری ہو گئی اور اس سرخی کے عقب میں ان گنت سلگتی خواہشوں کا دھواں تھا۔

"مریم! ہم نے غربت اور مسائل کے علاوہ دیکھا ہی کیا ہے' میں چھٹکارا پانا چاہتی ہوں' تھک چکی ہوں۔" اس نے گہری سانس لی اور دیوار سے سر ٹکا کر واقعی تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

"اوہ یہ سب تو تقدیر کے چکر ہیں آپی! ہماری کوششوں سے یوں معجزے رونما نہیں ہوتے۔ ٹھیک ہے' خدا کسی کی محنت اکارت نہیں جانے دیتا' مگر ہم تھوڑے سے صبر اور تھوڑی سی محنت پر اس سے زیادہ صلے کی توقع باندھ لیتے ہیں اور خدا کے نافرمان ہو کر اس کے ناپسندیدہ راستوں پر دوڑنے لگتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے یہ راستے ہمیں ہی نقصان پہنچائیں گے۔" مریم نے اس پر ترحم بھری نگاہ ڈالی۔

"پتا نہیں' ہم تو ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے یہ زندگی یکایک اتنی تکلیف دہ کیونکر ہو گئی ہے۔"

"میں نے کہا ناں میں فطرتاً" کمزور ہوں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے مریم کو دیکھا جو یکدم ساکت ہو کر اب دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں مرتضیٰ حسن ایستادہ تھا۔ اس کا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ خاصی دیر سے کھڑا ہے۔

اس نے بھی مریم کی نگاہوں کے تعاقب میں مرتضیٰ حسن کو دیکھ لیا تھا۔ مگر بے پروائی سے ــــ رخ موڑ بھی لیا۔

اس نے سوچا اچھا ہی ہوا کہ اس کے سامنے بھی بات عیاں ہو گئی۔ جو ایک دن کسی اور طریقے سے کسی اور کی زبانی ہونا تھی۔ اس کے اس طرح چہرہ موڑ لینے اور چہرے پر ابھرے والے رکھائی کے تاثرات نے مرتضیٰ کو پلٹنے پر مجبور کر دیا وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"اچھا ہی ہوا کہ اسے بھی خبر ہو گئی۔" وہ گہری سانس بھر کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

مریم نے لب بھینچے بھینچے اس پر نگاہ ڈالی پھر تیزی سے کمرے سے نکل کر گرل کے دروازے کی طرف آئی جہاں مرتضیٰ حسن کھڑا نچلا ہونٹ ہموار دانتوں تلے دبائے خلا کو گھور رہا تھا۔

"ہر شخص کو حق ہے مریم! اپنی زندگی گزارنے کا' اپنی منشاء اور پسند کے فیصلے کرنے کا۔ تم اس پر کیوں جبر کرتی ہو' وہ کم فہم یا کمسن تو نہیں ہے۔" وہ مریم کی موجودگی محسوس کر کے آہستگی سے ایڑیوں کے بل پلٹا۔

پتا نہیں اسے خود کو لحہ بھر میں سنبھالنے میں کمال حاصل تھا یا پھر یہ ایسے خدشات بہت پہلے اس کے اندر آہٹ دیتے ہوئے چلے آئے تھے اور شاید ایسا ہی تھا' مریم نہیں جانتی تھی کہ وہ کئی بار اسے دانیال آفریدی کے بنگلے کی طرف کشاں کشاں جاتے دیکھ چکا تھا۔

اس نے گہری سانس بھر کر اپنی ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے کے بند دروازے کو دیکھا پھر مریم کو۔

"تم اسے کیوں اس رشتے پر راضی کرنے پر تلی ہوئی ہو جس کو وہ۔" مریم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اگر مجھے ایک فیصد بھی یقین ہوتا کہ اس نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اس کے حق میں بہتر ہے اور دانیال آفریدی برضا و رغبت اس سے شادی پر آمادہ ہے تو میں اسے بالکل نہ روکتی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ اس میں دلچسپی رکھتا تو میں بہن ہونے کے ناتے اس کی ہم نوا ہو جاتی' اس کی اس سرگرمی میں اس کا ساتھ دیتی' چاہے آپ ہرٹ ہوتے' مگر میں اس کی خوشی کے لیے' اپنی جان پر بھی کھیل جاتی مگر۔ ایسا نہیں ہے۔"

وہ گرل کے پھول میں انگلیاں پھنسائے شدید کرب سے بولی۔

"تمہاری سچائی اچھی لگی۔" وہ گرل سے پشت ٹکا کر اس کے چہرے پر نظریں ٹکائے پھیکے سے انداز میں ہنس دیا۔

"مگر مریم عثمان! وہ سچ ہی تو کہتی ہے' تم کوئی نجومی تو نہیں ہو کہ اس کا مستقبل تمہارے سامنے عیاں اور

روشن ہے۔"

"عیاں ہی تو ہے سب کچھ۔" وہ گرل پر جمی گرد کی ہلکی سی تہہ پر انگلی پھیرنے لگی۔

"سب کچھ عیاں ہے کچھ بھی تو نہاں نہیں۔" اس کی آواز پست اور بکھری ہوئی تھی پھر مرتضیٰ کی اٹھی ہوئی نگاہوں سے نظریں کتراتے ہوئے بولی۔

"اس کا مقصد حیات صرف دولت کا حصول ہے، چاہے وہ کسی طرح حاصل ہو۔ اسے دانیال آفریدی سے زیادہ اس کی کار، کوٹھی نے اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔

اور جو رشتہ اتنی ناپائدار شے کی بنیاد پر استوار کیا جائے، وہ کیسے اٹوٹ اور مضبوط مستقبل کی ضمانت ہو سکتا ہے۔"

"تم واقعی بہت سمجھ دار ہو۔ مگر بہرحال غیب داں نہیں ہو ۔" وہ اس پر نگاہ ڈال کر ہنس دیا۔ پھر جیب سے ہاتھ نکال کر چہرے پر یوں پھیرا جیسے کسی رنج کا تاثر مٹانا چاہ رہا ہو۔

"تم یہ بھی کیسے دعوا کر سکتی ہو کہ وہ مجھ سے شادی کر کے تاعمر آسودہ اور خوش رہے گی میں اس کے بہتر مستقبل کی ضمانت بن سکتا ہوں۔ یہ دعوا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا نا۔" کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولا پھر اس کی اپنی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں سمٹے تحیر اور الجھن کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

"اسے یہ بازی کھیلنے دو مریم! ہر شخص کا فلسفہ حیات مختلف ہوتا ہے۔ ضروری نہیں جو ہم سوچ رہے ہوں ویسا ہی ہو۔ جو خدشات تمہیں ڈرا رہے ہیں وہ محض وقت کے ساتھ پانی کا بلبلہ ثابت ہوں اور واقعی یہ کوئی خوشگوار موڑ ہو ندا کی زندگی میں انقلاب لانے کا۔"

وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ گہری سانس بھر کر ندا کے بند کمرے پر نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کی بائیک اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ تب تک وہ یونہی گرل میں انگلی پھنسائے کھڑی رہی۔ پھر دھیرے سے ہنسی۔

مگر اس کی ہنسی روح سے خالی تھی اس پیتل کے برتن کی طرح جسے کوئی ہلکے سے لڑھکا دے تو وہ ٹھن ٹھن ذرا سا بج کر تھم جائے۔

♥ ♡ ♡ ♥

دانیال آفریدی خود کو سخت ٹینشن میں پا رہا تھا وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا۔ مگر وہ تو جیسے اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ اسے رحم بھی آ رہا تھا ندا عثمان پر۔

یہ اس کی عمر تو نہ تھی، پرائے بچوں کی خاطر خود کو آگ میں جھونکنے کی۔ وہ اسے ہر طرح سے سمجھا چکا تھا بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اس کو مقدر کا لکھا سمجھ لیا اور یہ بھی سوچ کر ایک طرح سے مطمئن ہو گیا کہ چلو بچوں کی طرف سے فکر کم ہو جائے گی۔ وہ ندا سے اٹیچ تھے اور ندا بھی ان سے والہانہ پیار کرتی تھی۔ کیا خبر کوئی دوسری عورت اس کے بچوں کو ایسا پیار نہ دے سکے۔ یوں بھی وہ یہ گھونٹ بچوں کی خاطر ہی پی رہا تھا۔

دانیال آفریدی کی سگی پھوپھی رشتہ لے کر آئی تھیں۔ امی تو انگشت بدنداں رہ گئیں۔

دو بچوں کا باپ۔ ان کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ جبکہ ان کی بیٹی ابھی بائیس کی بھی نہ ہوئی تھی۔ خوب صورت، جوان، پڑھی لکھی اور پھر سگی بہن کے بیٹے سے منسوب بھی تھی۔ وہ کیونکر اس رشتے میں معمولی سی بھی دلچسپی لیتیں۔ وہ تو اسی وقت انکار کرنے کے موڈ میں تھیں مگر مریم کی تنبیہہ آمیز نظروں نے انہیں اس موقع پر کچھ بولنے سے باز رکھا۔ تاہم وہ پورا وقت الجھن میں مبتلا رہیں اور جوں ہی دانیال آفریدی کی پھوپھی نکلیں وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

"کیا سوچ کر آئی تھیں یہ محترمہ! کیا جوڑ ہے میری بچی کا ان کے بھتیجے سے، کہاں ہے ندا اسے بھی ذرا پتا تو چلے کہ جن کے بچوں کو وہ خلوص اور ہمدردی میں پڑھانے جاتی ہے وہ صاحب تو جانے کیا امیدیں وابستہ کر کے چلے آئے رشتہ لے کر۔"

مریم کا دل چاہا، وہ امی کی اس سادہ لوحی پر جی بھر کر قہقہے لگائے۔ مگر بہرحال یہ سچویشن ہنسنے کی نہیں تھی بلکہ سنبھالنے کی تھی۔

وہ خالی کولڈ ڈرنک کی بوتلیں کچن کی سلیب پر رکھ کر باہر آ کر بولی۔

"ندا کو خبر ہے، آپ کیا باخبر کریں گی۔" اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو اس کے جملے پر ایک ٹک اسے ہی گھورے جا رہی تھیں پھر نظریں ملنے اور جلدی سے مریم کے نظریں کترا لینے پر ان کے اندر چھناکا سا ہوا۔

"تو کیا یہ سب ندا کی ایما پر ہوا ہے۔" وہ بولیں تو ان کی آواز میں لرزش تھی۔ مریم نے آہستگی سے سر ہلایا جیسے یہ اسی کی خطا ہو، وہ مریم نہیں ندا ہو۔ مگر وہ دل سے خود کو اس لیے مجرم سمجھ رہی تھی کہ اسے اب ندا کی حمایت کرنی تھی کہ ندا نے رات بھر رو رو کر اس سے التجائیں کی تھیں، اس کے سامنے اتنا سر پٹخا تھا کہ وہ بے بس ہو گئی تھی وہ اس کی دشمن تو نہ تھی اس کی سگی بہن تھی اسے جان سے عزیز تھی اس کے آنسو اس کے دل پر انگاروں کی طرح گرتے تھے اور اس نے اس کی خاطر امی کو قائل کرنے کی ذمہ داری لے لی تھی۔

"کیا وہ نہیں جانتی ۔ کہ وہ مرتضیٰ سے منسوب ہے اور۔" امی کی آواز ابھری اور وہ جانتی تھی اب ان کے نہ ختم ہونے والے سوالات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اس نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر نرمی سے دباؤ ڈالا۔

"آپ بیٹھ تو جائیے پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" اس نے کہا تو امی نے قہر آلود نظروں سے گویا اسے چھید ڈالا اور جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور پانی کا گلاس ٹیبل پر پٹخا۔

"تو تم بھی شامل ہو اس کے اس کھیل میں، تم... تم...... بھی مریم۔"

"امی۔"

"ٹھیک کہتے ہیں لوگ۔ بیٹیوں کو اتنا پڑھانا لکھانا ہی نہیں چاہیے کہ وہ ماں باپ کے فیصلوں سے انحراف کرنے لگیں۔ خود کو عقل مند سمجھنے لگیں۔ بتاؤ۔ بتاؤ کیا خرابی ہے مرتضیٰ میں۔ کس لحاظ سے کم ہے وہ کہ اسے نظرانداز کر کے اس نے دو بچوں کے باپ اور اپنی عمر سے دو گنے شخص سے شادی کا سوچا۔"

وہ وہیں کرسی پر گر سی گئیں اور سر ہاتھوں میں تھام لیا پھر رونے لگیں۔

مریم کا دل سینے کی دیواروں میں لہو لہو کر رہ گیا۔

(کتنے دل توڑو گی آپی۔ دولت کی محبت نے تو تم سے رشتوں کی محبت ہی چھین لی) اس نے پردے کی آڑ میں کھڑی ندا کو دیکھ کر سوچا پھر امی کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے زانو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"بہت اچھے ہیں مرتضیٰ بھائی! مگر امی آپی نے انہیں شروع ہی سے اس نظر، اس رشتے سے ناپسند کیا ہے، وہ انہیں دل سے محض بھائی سمجھتی ہیں اور۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز لرز سی گئی۔ امی چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہیں۔

"کیا حرج ہے امی۔ یہ تو اللہ نے بھی حق دیا ہے عورت کو کہ وہ۔"

"ہاں کہ وہ اپنے لیے بر ڈھونڈتی پھرے۔ اچھے رشتے ٹھکرا کر دل کی فضول خواہشات پر چلے۔ یہ سراسر بے وقوفی ہے کہاں ہے ندا اسے بلاؤ میرے پاس۔"

"میں نے اسے بہت سمجھایا ہے امی! اور وہ کوئی بچی نہیں ہے کہ اس پر سختی کی جائے۔ سختی اسے باغی کر دے گی۔ اسے تنہا کر دے گی اور ایسے میں اسے ہم سب کی ضرورت ہے آپ کی دعاؤں کی۔ دیکھیے امی۔" اس نے امی کو درمیان میں کچھ بولتے دیکھ کر جیسے روکا اور جلدی سے بولی۔

"یہ رشتے، یہ تعلقات زبردستی نہیں باندھے جا سکتے۔ کیوں آپ اس کے ساتھ مرتضیٰ بھائی کو بھی کانٹوں پر گھسیٹنا چاہتی ہیں اور پھر وہ بھی جانتے ہیں، اسی لیے خاموشی سے ندا کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔"

اس نے نظریں جھکا لیں اور خود کو شدید ترین احساس بے بسی میں مبتلا محسوس کیا۔

امی کی نگاہیں اسے دل کو چھیدتی محسوس ہو رہی تھیں۔ حالانکہ ان میں نفرت نہیں تھی، قہر نہیں تھا، بس شکوہ تھا، دکھ تھا، صدمہ تھا اعتماد ٹوٹنے کا لہو تھا۔ وہ

مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم سمجھنے لگی خود کو۔

"تم تو بہت سمجھ دار اور عقل مند تھیں مریم! اب تم یہ کہہ رہی ہو' اتنی نادانی کی باتیں۔" انہوں نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر جیسے درد سے پھٹتے سر کو سنبھالا دینے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

ان کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا اور پھر وہ ندا کی خود سری سے واقف تھیں۔ وہ اب بچی نہیں تھی۔ جوان تھی اور جوان لڑکیوں کا ضدی اور باغیانہ پن بہت خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوتا ہے والدین کے لیے بھی اور خود ان کے لیے بھی۔

"بہر حال۔ میں معلومات کروں گی کہ اس نے ندا کا ہی انتخاب کیوں کیا؟"

"اس نے نہیں۔ ندا نے اس کا انتخاب کیا ہے امی اور میں یہ سچ نہیں چھپا سکتی کہ وہ از خود اس رشتے پر راضی نہیں تھا یہ سب ندا کی کوششوں سے ہوا ہے۔ وہ دولت مند ہے امی! بہت دولت مند اور ندا نے بہت کاروباری انداز سے سوچا ہے۔" ندا نے جھینپ کر پردہ گرا لیا تھا جبکہ امی مریم کی بات پر گم صم سی رہ گئی تھیں۔

"اس کے لیے آپ دانیال آفریدی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتیں۔ اس نے تو ندا کو ہر ممکن طریقے سے باز رکھنا چاہا۔ پھر بھی آپ ماں ہیں' اپنے طور سے اسے سمجھانا چاہیں تو میں نہیں روکوں گی۔ مگر یہ کوشش عبث ہی ہوگی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی' اس میں کم از کم اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ محبت کرنے والی' نرم مزاج' ہمدرد" مخلص ماں کو اس بری طرح ٹوٹتے دیکھتی۔

جس کی بیٹی اس چھوٹے سے مکان سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اسے یہ گھر تنگ و تاریک لگنے لگا تھا۔ اسے یہ دیواریں نیچی لگنے لگی تھیں اس لیے کہ اس کے خواب ان دیواروں سے زیادہ اونچے ہو گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

بالآخر مریم کی طرح امی کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

ابو کو پتا نہیں انہوں نے کیسے منایا تھا۔

دانیال آفریدی کی طرف سے بہت سادگی سے رسمیں ادا کی گئیں۔ یہاں بھی کسی کو امنگ نہ تھی' امنگیں تو صرف ندا کے دل میں کروٹیں لے رہی تھیں۔

بیش قیمت عروسی جوڑا' بری کے تین بھرے بھرے بیگ اور پھر لمبی سی گاڑی میں رخصت ہو کر جانا' گاڑی سے آراستہ پیراستہ بنگلے میں قدم رکھنا۔ جس کا ہر کمرہ مکمل فرنشڈ تھا۔

ہر ہر شے پر اب اس کا حق تھا۔ اسے لگا تتلیاں اس کے اردگرد رقص کر رہی ہوں۔

وہ سب کچھ بھول گئی ان بچوں کو بھی جن کو سیڑھی بنا کر وہ اس منزل تک پہنچی تھی۔ مگر اس کے بھول جانے سے کیا ہوتا تھا۔ دانیال آفریدی تو ان بچوں کی خاطر ہی اسے یہاں لایا تھا۔ اپنا نام دیا تھا اور گھر کا اختیار سونپا تھا۔

وہ آفس جاتے جاتے اسے ضرور تاکید کر جاتا۔

"بچوں کا خیال رکھنا۔" اور وہ خوش دلی سے سر ہلا دیتی۔ مگر رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونے لگا کہ دانیال آفریدی اسے بچوں کی گورنس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

مگر ایسا بھی نہیں تھا۔

اس کی الماری نت نئے کپڑوں اور قیمتی چیزوں سے چھلکی پڑتی ایک گاڑی اس کے استعمال میں رہنے لگی تھی اسے جہاں جانا ہوتا وہ نکل کھڑی ہوتی جب شاپنگ کرنا ہوتی' اسے ڈھیر سارے روپے مل جاتے۔

مگر اسے لگا جیسے وہ یہ سب حاصل کرنے کے باوجود اتنی مسرور نہیں' اتنی مسرت محسوس نہیں کر رہی ہے' جتنا اس کے خیال میں کرنا چاہیے۔ ہر شے دسترس میں ہونے کے باوجود ایک کمی سی تھی ایک خلا سا تھا ایک اداسی سی تھی۔

دل یونہی خالی خالی ویران سا تھا۔

اس نے ایک روز اپنی یہ کیفیت مریم کے سامنے ظاہر کر دی۔

"ایسا کیوں ہے مریم یہ سب تو میرا خواب تھا' پھر

میں خوش کیوں نہیں ہو پا رہی ہوں۔" اس نے اپنی کلائی میں دمکتی ڈھیر ساری سنہری چوڑیوں کو دیکھا پھر دونوں ہاتھ پہلو میں گرا دیئے اور دیوار سے پشت ٹکا لی۔

"اس لیے آپا کہ تم نے بس یہی خواب دیکھے تھے' تم نے تن کو آباد کرنے کا سوچا' من کو نہیں۔ اس کی سیرابی اور خوشی نہیں چاہی۔"

مریم کی بات سو فیصد سچ تھی مگر وہ تڑپ کر اسے جھٹلانے لگی۔

"ایسا بھی کچھ نہیں تھا۔ میں صرف دولت مند اور امیر ہونا ہی تو نہیں چاہ رہی تھی۔ میں دانیال سے محبت ....." مریم کی خاموش نظریں اس پر جمی تھیں اس کی نظریں جھک گئیں۔

"ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں کہ۔" وہ اپنی آواز میں زور پیدا نہ کر سکی تھی' پھر یکدم جیسے مزاحمت کرنے والے انداز میں بولی۔

"اتنا تو مجھے ملنا چاہیے جو میرا حق ہے' میں اپنا حق حاصل کر کے رہوں گی' میں اس کے بچوں کی گورنس نہیں ہوں نہ اس کے گھر کا شوپیس کہ وہ مجھے سجا کر غافل ہو جائے۔"

"کون سا حق آپی!" مریم نے انتہائی دکھ اور آزردگی کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ "اس حق سے تو تم شادی سے پہلے ہی دستبردار ہو چکی تھیں۔"

"بکواس ہے یہ سب' وہ میرا جذباتی پن تھا' اس طرح کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ کر غصے سے چیخی اور پھر پلٹ کر باہر نکل گئی۔

اسے اب بچوں سے نفرت سی ہونے لگی تھی یوں بھی محبت تو کبھی تھی ہی نہیں مگر اب۔ اسے لگتا جیسے یہ بچے ہی ہیں جن کی وجہ سے وہ دانیال سے دور ہے۔ اب تک اور دانیال آفریدی اس سے غافل ہے اور اس کی زندگی میں جو خلا ہے' کمی ہے' دانیال آفریدی کی بے اعتنائی کے باعث ہی ہے' وہ اب اس سے الجھنے لگی تھی۔

"میں گورنس نہیں ہوں بچوں کی۔ بیوی ہوں آپ کی آپ مجھے اس گھر میں لا کر بھول گئے ہیں۔"

اس روز دانیال آفریدی نے ایک انویٹیشن کارڈ لا کر اس کے سامنے رکھا یہ کہتے ہوئے کہ تم بچوں کے ساتھ ہو آنا۔

"میرے پاس تو وقت نہیں ہے' ورنہ پھوپھی جان ناراض ہوں گی۔"

یہ کارڈ پھوپھی کے پوتے کے عقیقے کا تھا' مگر ندا نے یہ کارڈ اٹھا کر اس کے چار ٹکڑے کر کے بیڈ پر پھینک دیئے۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ گو کہ کئی دنوں سے اس میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس تو کر رہا تھا۔ مگر نظر انداز بھی کرتا آ رہا تھا۔ مگر آج کی یہ حرکت اسے قطعی گراں گزری تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اس گھر میں تمہیں کیا حاصل نہیں پورے گھر کی مالک ہو۔" اس نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اپنا کوٹ اٹھا کر ہینگر میں ڈالنے لگا۔

"ہاں گھر کی مالک ہوں دیواروں کی مالک ہوں' گاڑی کی مالک ہوں۔" وہ استہزائی انداز میں ہنس پڑی۔ "بس آپ کے دل کی مالک نہیں ہوں' ان خاموش اور بے جان چیزوں سے دل نہیں لگایا جا سکتا دانیال صاحب۔"

"شٹ اپ۔" وہ غصے سے پلٹا' پھر یکدم اپنی آواز کی اونچائی کا خیال کرتے ہوئے لہجے کو پست کر کے بولا۔

"تم بچوں کو بھول رہی ہو' ان بے جان چیزوں کے علاوہ وہ زندہ جیتے جاگتے انسان ہیں جن سے تم دل لگا سکتی ہو' بلکہ ان ہی کی محبت میں تم یہاں تک اس گھر میں آئی ہو۔ مت بھولو کہ میں تمہیں گھر میں بسانے کو لایا ہوں دل میں نہیں' یہ بات میں پہلے ہی تم پر واضح کر چکا ہوں۔" وہ اپنا شلوار سوٹ اٹھا کر واش روم میں چلا گیا اور دروازہ زور سے بند کر دیا اور اسے لگا جیسے اس نے غسل خانے کا نہیں اپنے دل کا دروازہ اس زور سے بند کیا ہو' مگر وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی' یوں بھی صلح جوئی' اس کی فطرت نہیں تھی وہ ضدی اور خود سر تھی' اس نے بچوں سے کھلی بے زاری کا اظہار کرنا شروع

کردیا اور اب روز ہی اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے لگی۔

اس روز اس نے کسی بات پر احمد کو تھپڑ مارنا چاہا کہ دانیال آفریدی نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے نیچے کر دیا۔

اس کی سنہری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور جبڑے بھنچ گئے تھے' اگر وہ اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنے والا آدمی نہ ہوتا تو شاید اسے پکڑ کر کئی طمانچے جواباً اس کے منہ پر مار دیتا۔ مگر وہ عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں کمینگی خیال کرتا تھا۔ وہ فطرتاً صلح جو اور نرم طبع تھا۔

اچانک اس افتاد پر وہ لڑکھڑا کر قریبی دیوار سے لگ گئی تھی۔

دانیال آفریدی اسے تاسف اور رنج سے ایک ٹک دیکھ رہا تھا اسے دکھ احمد کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھانے سے زیادہ اعتبار ٹوٹنے پر ہوا تھا' اس کی اصلیت کھل جانے پر ہوا تھا۔ دھوکا کھانے پر ہوا تھا۔

"تو ندا عثمان! تم نے میرے بچوں کو محض سیڑھی بنانے کے لیے استعمال کیا۔ ان سے محبت کا ڈھونگ رچایا تھا تم۔ تم یہ دولت اور پھر دولت کے بعد مجھ تک رسائی چاہتی تھیں۔ خوب، بہت بھرپور اداکارہ ہو۔ میں داد دیتا ہوں تمہاری ایکٹنگ کی۔" اس نے احمد کو ایک طرف صوفے پر بٹھایا اور چلتا ہوا اس کے پاس آ کر اس سے دو قدم رک گیا۔ اس کے لبوں پر تمسخر تھا' مگر آنکھوں میں اپنے اعتبار کی ٹوٹی کرچیاں۔

"مگر تھوڑی جلد باز ہو۔ سب کچھ جلد پا لینا چاہتی ہو۔" وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا' وہ بے عنوان سی شرمندگی محسوس کر کے اس کے قریب سے نکل کر دور جا کھڑی ہوئی' پھر ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

"جب سب کچھ کھل چکا ہے تو میں بھی بتا دوں کہ مجھے عمر بھر بچوں کی گورنس رہنا قبول نہیں ہے' ٹھیک ہے کہ میں نے اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے آپ سے شادی کی تھی۔" اس نے بے خوف لہجے میں کہا۔ وہ بے عنوان شرمندگی کے تکلف سے بھی نکل آئی تھی' اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اب کوئی شرمندگی' ندامت یا خوف نہیں تھا۔

"میں کسی افسانے کا کوئی کردار نہیں ہوں کہ سوتیلے بچوں کی خدمت کر کر کے اور صبر کے پہاڑ اٹھا اٹھا کر آپ کا دل جیتنے کی کوشش کروں' یہ تو میرا حق ہے جو مجھے ہر حال میں ملنا چاہیے۔"

اس کی بات پر وہ استہزائیہ انداز میں دھیرے سے مسکرایا۔

"مجھے نہیں پتا میں فکشن نہیں پڑھتا کہ اس میں یوں بھی کچھ ہوتا ہو گا اور نہ تمہیں دل جیتنے کے لیے کوئی زحمت اٹھانے کی ضرورت ہے' یوں بھی کوئی کسی کے دل میں اپنی محنت اور زور سے داخل نہیں ہو سکتا یہ بازار نہیں ہے' اس کے دروازے تو قلعوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور نہ اس میں موجود کسی کو نکالا جا سکتا ہے۔

تمہارا جو حق ہے وہ تمہیں مل رہا ہے اس سے زیادہ کی آرزو اگر ہے تو اسے یہیں ختم کر دو یا پھر......"

وہ لحظہ بھر رکا وہ اس کے بولنے کی منتظر رہی' مگر پہلو میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"یا پھر عمر بھر اپنی تشنہ کامی پر بصد شوق آنسو بہاتی رہو۔"

وہ جانے کو پلٹا تو وہ جارحانہ انداز میں بھاگ کر اس کے سامنے آ گئی۔

اس کی آنکھوں میں خود سری اور ضد کی پرچھائیں تھی۔

دانیال آفریدی نے متاسفانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے قدرے سختی کے ساتھ ایک طرف ہٹا دیا۔

"مجھے مجبور مت کرو ندا! کہ میں ایک گھٹیا مرد بن کر تمہاری تذلیل پر اتر آؤں۔ میرا ہاتھ اٹھنے لگے' میں اس گھر کی فضا خراب نہیں کرنا چاہتا' میں اپنے بچوں کو ایک اچھا ماحول دینا چاہتا ہوں' محبت کی فضا دینا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنے لہجے کی کشیدگی کو قدرے دباتے ہوئے رسان سے بولا۔

"محبت کی فضا قائم کرنے کے لیے دو طرفہ محبت

کے اصول پر چلا جاتا ہے مسٹر دانیال!۔ محبت کی فضا کچھ دینے اور لینے سے ہی بنتی ہے۔"

"تم ایک خود غرض اور مفاد پرست عورت ہو' تم سے محبت کی جائے' تمہیں محبت دی جائے۔ نہیں قطعی نہیں' تم اس قابل ہی نہیں ہو۔ جس رشتے کی بنیاد ہی جھوٹ اور مفاد پر رکھی ہو وہ رشتہ کبھی مضبوط نہیں ہوتا۔ تم نے میرا' میرے بچوں کا اعتماد توڑا ہے' اب محبت کی توقع کر رہی ہو۔"

وہ اہانت کے احساس سے سلگ کر رہ گئی۔ وہ اسے نہایت تاسف آمیز اور ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے احمد کی انگلی پکڑی اور اسے لے کر کمرے سے نکل گیا۔

وہ اپنے بکھرتے اعصاب کے ساتھ کتنی دیر کھڑی رہ گئی۔

اس کا رواں رواں جیسے انگاروں پر رکھ دیا گیا تھا وہ سلگ رہی تھی۔

مگر اس نے فیصلہ کر لیا وہ مزید برداشت نہیں کرے گی۔ وہ اس گھر میں اپنی حیثیت منوا کر رہے گی یا پھر نہیں رہے گی۔

دوسرے روز اس نے اپنا بیگ بھرتے ہوئے چیختے لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا اور وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر ایک گہری سانس بھر کر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں نہیں روکوں گا' یوں بھی میں جبر کا قائل نہیں ہوں۔ تم عمر کے جس دور سے گزر رہی ہو' وہاں یہ تقاضے کچھ غلط بھی نہیں ہیں مگر میں تمہیں پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ میرا وجود خالی مکان کی طرح ہے تمہیں یہاں ویرانی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ مگر اس وقت تمہاری ضد کا پس منظر میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ تم نے غلط بیانی سے کام لیا اور اب اپنے جال میں دراصل تم خود پھنس گئی ہو۔ سوری فار دیٹ کہ میں تمہیں نہیں روک سکتا۔ تم سمجھ دار ہو۔ ہاں مگر اس گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ آنا چاہو گی تب بھی تمہیں نہیں روکوں گا۔"

اس نے یہ کہہ کر سر سے پیر تک چادر تان لی تھی وہ رنج سے شق دل کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔ اس کا تو خیال تھا یہ حربہ کارگر ثابت ہو گا' وہ اس کے فیصلے سے پریشان ہو کر اسے روکنے کے جتن کرے گا شاید وہ شخص زندگی کو ہر طرح سے برتنے کا فن سیکھ چکا تھا اور پھر وہ خاموشی سے اس گھر سے نکل آئی' کئی دنوں سے تو بچوں سے بھی ایسا رویہ روا رکھا تھا کہ وہ بھی اب اسے روکنے کی ہمت نہ کر پا رہے تھے' ایک اجنبیت اور خوف کی دیوار حائل ہو چکی تھی اس کے اور بچوں کے مابین۔

بچے نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ان کی نئی ممی نے انہیں محض سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ان کی معصوم محبتوں سے اپنا مفاد نکالا تھا' وہ تو بس الجھن میں تھے کہ اتنی اچھی ممی کو یکدم کیا ہو گیا وہ ان سے کھنچی کھنچی کیوں رہنے لگیں یہ محبت نفرت میں کیونکر بدل گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

تیری نظر کا گلہ کیا جو ہے گلہ دل کا
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

"مریم! یہ افسانہ تو نہیں حقیقت ہے۔ میری زندگی کا معاملہ ہے۔" وہ اب مستقل آزردگی کی کیفیت میں رہنے لگی تھی۔

کبھی اضطراب' کبھی گہری تھکن' چھانے لگتی۔ تو کبھی پچھتاوے ڈسنے لگتے اور کبھی اپنی محرومی کا احساس ستانے لگتا۔

"افسانے بھی حقیقت سے متاثر ہو کر ہی لکھے جاتے ہیں آپی فکشن اور فیکٹ میں تھوڑا ہی تو فرق ہے۔ بہرحال۔"

مریم اس کی آزردگی اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔

"تم نے ایک محبت پانے کے جتن میں بچوں کی محبت بھی کھو دی آپی۔" اس نے دکھ سے اسے دیکھا۔

وہ ہونٹ بھینچے چائے کے مگ پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی یکدم سر اٹھا کر سلگتی نظروں سے مریم کو دیکھا۔ اور بولی۔

"وہ میرے بچے نہیں ہیں' پھر میں کیوں ان کی محبت حاصل کرنے کے جتن کروں' میرا خواب' میری آرزو یہ بچے کبھی نہیں رہے ہیں' میں اتنے بڑے دل

کی نہیں ہوں۔ میں اس معاشرے کی ایک عام سی لڑکی ہوں' کوئی عظیم عورت نہیں' مجھ سے نہیں ہوتی بچوں کی چاکری' میں اس گھر میں صرف اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے گئی تھی' کسی دوسرے کی محرومیوں کو دور کرنے نہیں۔ صرف اپنی محرومی کو ختم کرنے گئی تھی۔" سب کا اپنا اپنا فلسفہ حیات ہوتا ہے اور اپنے تیئں ہر شخص اسے ہی درست سمجھتا ہے' ندا عثمان بھی کچھ دو اور لو کے اصول سے منحرف تھی وہ صرف "لینے" وصول کرنے کی تگ ودو میں تھی۔

وہ ایک عظیم عورت تو کیا ایک عام سی صابر عورت بننے پر بھی تیار نہیں تھی۔ وہ چھین لینے کے درپے تھی۔ مگر دانیال آفریدی کا دل کوئی چیز تو نہیں تھی کہ وہ اسے جھپٹ لیتی۔

آکشن میں رکھا ہوا مال تو نہیں کہ خرید لیتی۔

کسی کو پانے کے لیے تو اپنی ذات کو درمیان سے نکال دینا پڑتا ہے' ہزار قربانیاں مانگتی ہے یہ محبت' محبت کے رستے اتنے سہل کب ہیں آپی! یہ تو صرف دور سے پودے پر کھلا ہوا گلاب کا پھول دکھائی دیتی ہے جو آنکھوں کو دیکھنے سے بھلا لگتا ہے مگر قریب جاؤ تو احساس ہوتا ہے۔ اس پھول کو پانے کے لیے کتنے کانٹوں سے الجھنا پڑے گا۔

بے شک محبت چلچلاتے گرم صحرا میں ٹھنڈا میٹھا چشمہ بھی ہے' مگر'

اس نے وہیں دیوار سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں۔

محبت مورتی ہے
مگر کبھی جو دل کے مندر میں کہیں پر ٹوٹ جائے تو
محبت کانچ کی گڑیا
فضاؤں میں کسی کے ہاتھ سے گر چھوٹ جائے تو
محبت آبلہ ہے کرب کا
اور پھوٹ جائے تو
محبت روگ ہوتی ہے
محبت سوگ ہوتی ہے

اس کی آنکھوں سے بے آواز وہ پانی بہہ رہا تھا جسے وہ ایک عرصے سے اپنے اندر اتارتی آئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ کالج گیٹ سے نکلی تو مرتضیٰ حسن کو بائیک پر اپنا منتظر دیکھ کر چکرا کر رہ گئی۔

"آپ پھر آ گئے۔؟" وہ اس کی طرف چلی آئی۔

"وہاٹ ڈو یو مین۔ پھر آ گئے؟" اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں کوئی تھرڈ ریٹ عاشق ہوں' جو تمہاری راہ میں آجاتا ہوں تمہیں تنگ کرنے۔"

"خیر تھرڈ ریٹ عاشق تو نہیں ہیں مگر ان میں ضرور آجاتے ہیں۔" وہ بھی اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی پھر قدرے سنجیدگی کے ساتھ بولی۔

"اچھا نہیں لگتا مرتضیٰ بھائی! اس طرح آپ کا کالج آنا اور میرا آپ کے ساتھ بیٹھنا۔ آپ کو پتا نہیں یہاں لمحوں میں رنگین کہانیاں بن جاتی ہیں اور سب کے ہاتھ مشغلہ آجاتا ہے۔"

اس کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا مگر وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر بائیک سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"بننے دو' کیا حرج ہے' کبھی رنگین کہانی کا کردار بن جانے میں بھی مزا ہے۔"

"ہاں حرج تو نہیں۔ بس ذرا بدنامی ہی تو ملے گی' تھوڑی رسوائی۔" وہ اسے خشمگین نظروں سے گھورنے لگی۔

سادہ سے سفید شلوار قمیص میں دھوپ سے نہائے پھول کی طرح دل آویز لگ رہی تھی۔ مرتضیٰ حسن نے چہرہ موڑ لیا اور اس کے بیٹھتے ہی بائیک اسٹارٹ کر دی۔

"سنا نہیں تم نے' بدنام ہوئے تو کیا نام نہ ہوگا۔"

"مگر کس نے کہا کہ مجھے نام کا شوق ہے۔" وہ ہوا سے اڑتی چادر سنبھالتے ہوئے بولی۔ "بہرحال آئندہ محتاط رہیے گا۔"

"مثلاً" کیسے؟" وہ بائیک ہوا میں اڑاتا اسی غیر سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔ "برقعہ پہن کر آؤں یا سفید داڑھی اور سفید بالوں کے گیٹ اپ میں۔ تاکہ کوئی رنگین کہانی نہ بنے" اس نے کہتے ہوئے سائڈ مرر سے اس کو دیکھا پھر اس کے چہرے کے زاویے دیکھ کر ہنس پڑا۔

بائیک اس نے ایک کیفے کے آگے روک دی اور اس کی نگاہوں میں ابھرنے والا سوال زبان سے ادا ہونے سے پہلے جلدی سے بولا۔

"شدید قسم کی بھوک لگی ہے' دیکھو ذرا اپنی رسٹ واچ' یہ لنچ کا ٹائم ہی ہے نا۔"

وہ یکدم سنجیدہ سی ہو گئی۔

"آپ لنچ گھر پر بھی تناول فرما سکتے ہیں' یہاں آنا ضروری تو نہیں تھا۔"

"ضروری تھا' لنچ اتنا ضروری نہیں تھا۔ جتنا یہاں آنا ضروری تھا در اصل میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ باتیں گھر پر ندا کی موجودگی کے باعث نہیں ہو سکتیں۔"

"بہرحال! یہ بھی صحیح نہیں۔" وہ خفیف سی ناراضگی کے ساتھ بائیک سے اتر کر جیسے بحالت مجبوری اس کے ساتھ چلنے لگی۔

وہ ضدی نہیں تھی اور نہ ہی اپنی بات منوانے کا ڈھنگ اسے آتا تھا۔

وہ خاموشی کی فضا میں لنچ کرتے رہے پھر یکدم خیال آنے پر اس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے مرتضیٰ حسن کی طرف دیکھا۔

"آپ کو تو کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔" اس کے استفسار پر اس نے ایک گہری سانس بھری۔

"تھینکس گاڈ تمہیں یاد تو آیا' میں سمجھا ابھی کھا پی کر کہو گی "اب گھر چلیں اور میری تو مفت میں اتنی پاکٹ منی ماری جاتی۔" وہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

"یہ آپ اتنے غیر سنجیدہ کب سے ہو گئے ہیں۔" اسے حقیقتاً حیرت ہوئی تھی۔

"جب سے زندگی سے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا ہے۔" اس نے کہا' تو اس کا اٹھا ہوا سر اسی زاویے پر کچھ دیر ٹھہر گیا وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہاں مریم جب سے یہ دل ٹوٹا اور دل تو کیا جو خواب بچپن سے دکھایا جا رہا تھا اسے یکدم چھین لیا جائے تو اذیت تو ہوتی ہے نا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا' ایک نام سنتے سنتے آرزوؤں کا محل تعمیر ہوتا گیا' ایک انسیت دھیرے دھیرے محبت میں بدلنے لگی تھی کہ۔" وہ لحظہ بھر رکا۔ مریم نے کرب سے لب دانتوں میں دبا کر سر جھکا لیا اور بے حد اپنائیت اور نرمی سے میز پر رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر گویا بے نام سی تسلی دینی چاہی۔

اپنے گرم ہاتھ پر اس کا ٹھنڈے میٹھے چشمے جیسا ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ چونک سا گیا' پھر ہولے سے مسکرا دیا۔

"تھینک یو' مگر مریم! اب میں اس اذیت سے نکل آیا ہوں' میں نے سوچا کہ زندگی صرف اپنی خواہشوں کے حصول میں تو نہیں کاٹ دینی چاہیے' ہمارا وجود بہت سے لوگوں سے وابستہ ہے' بہت سے لوگوں کی ہم سے خوشیاں' سکون اور وقار وابستہ ہوتا ہے۔ یہ دیکھو یہ سب لوگ جو ہمیں مطمئن نظر آتے ہیں۔ یہ ہمارا خیال ہے ہر شخص اندر سے کچھ مضطرب پریشان یا دکھی ہوگا۔ زندگی سیدھی سڑک کی مانند ہوتی تو شاید ایک جمود طاری ہوتا' دنیا اتنی رنگ برنگی نظر نہ آتی۔ ایک سا ہی رنگ چھایا رہتا۔

'نہ امنگیں ہوتیں' نہ خواہشیں جنم لیتیں' نہ امیدوں کا کھیل ہوتا۔

"یہی زندگی ہے اور اسی زندگی میں خوشیاں بھی ہیں اور دکھ بھی چھپے ہیں۔"

مریم کھنچے کھنچے اعصاب کے ساتھ کچھ بے یقین سی کیفیت میں جیسے بنا سانس لیے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

وہ اسے گومگو میں مبتلا دیکھ کر زیر لب مسکرا دیا۔

"مریم! جب علم ہو جائے کہ جسے آپ ہیرا سمجھ کر اس کے کھو جانے کا غم منا رہے تھے وہ ہیرا نہیں عام سا پتھر ہے تو کیا پھر بھی غم منایا جا سکتا ہے۔" وہ یکدم دونوں ہتھیلیاں میز کی سطح پر ٹکا کر اس کی کھلی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تو وہ سٹپٹا کر پیچھے ہو گئی۔

"میں ندا کو پتھر نہیں کہہ رہا' مگر یہ ضرور کہوں گا کہ وہ گوہر نایاب بھی نہیں تھی۔ یہ تو مجھے اس وقت ہی احساس ہو گیا تھا۔ جب اس کے قدم دانیال آفریدی کے بنگلے کی طرف کشاں کشاں۔"

"پلیز اسٹاپ اٹ۔" وہ جھٹکے سے کرسی دھکیل کر یکدم کھڑی ہو گئی۔

مرتضیٰ نے دیکھا' اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یہ سرخی ناگواری کی تھی۔

"آپ یہی باتیں کرنے لائے تھے مجھے یہاں۔ میری بہن کیا تھی کیا ہے اور کیا نکلی' اس سے اب آپ کو غرض نہیں ہونی چاہیے۔" وہ باوجود ضبط کے غصے میں آگئی مگر وہ قطعی برا مانے بغیر بے حد نرمی سے بولا۔

"سوری۔" میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا بیٹھ جاؤ۔ باتیں تو مجھے کچھ اور ہی کرنی تھیں۔" اس کے لبوں کی تراش میں پھیلی مسکراہٹ کچھ کشادہ ہو گئی۔

وہ سلگ کر رہ گئی۔

"مثلاً" کیا۔" اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا وہ بے دلی سے بیٹھ گئی۔

"میں دانیال آفریدی سے ملا تھا۔" اس کے بیٹھنے پر وہ اصل موضوع پر آیا جس کے لیے وہ اسے یہاں لایا تھا۔ اس کی بات پر وہ چونکی۔

"کب۔؟"

"کل شام۔ تقریباً" ایک گھنٹہ ہم دونوں یہاں اتفاق سے اسی میز پر باتیں کرتے رہے۔" اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

"کیا کہہ رہے تھے دانیال بھائی۔؟" وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھنے لگی' مگر مرتضیٰ ــــ جواب دینے کے بجائے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر یوں گہری سانس بھر کر مسکرایا جیسے انتہائی بچکانہ سوال سن لیا ہو۔

"کیا کہنا ہے انہیں۔ ندا عورت ہو کر انا اور ضد دکھا رہی ہے تو وہ تو مرد ہے اور اس کا تو اعتبار توڑا گیا ہے' اسے دھوکا دیا گیا ہے۔"

"مگر ــــ مگر ندا تو نادان ہے۔ وہ تو نادان نہیں ہیں نا۔" وہ بے تابی سے بولی۔ جس پر مرتضیٰ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ جس پر وہ خجل سی ہو کر رہ گئی۔

"نادانی میں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا اور ان ننھے ننھے بچوں کو جسے اس نے اپنا کر اب تنہا کر ڈالا' سائے کا احساس دلا کر دھوپ میں کھلا چھوڑ دیا۔ کیا قصور ہے ان معصوم بچوں کا جبکہ دانیال نے پہلے ہی اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اسے عزت دے گا' محبت نہیں اور اس وقت اس کا تقاضا بھی محبت نہیں تھا پھر تقاضے کیوں بڑھ گئے اور۔" وہ بولتے بولتے یکدم ہونٹ بھینچ کر چپ ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو نہ روک پائی۔

"مریم! اسے سمجھاؤ۔ کہ وہ اس گھر میں چلی جائے' ابھی دروازے کھلے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ راستہ بھی گم کر دے ــــ دولت' عزت' محبت سب کچھ تو یکمشت ہاتھ نہیں آجاتا نا۔ کسی ایک کی تو قربانی دینا پڑتی ہے۔" وہ متاسفانہ سانس بھر کر کھڑا ہو گیا اور بائیک کی چابی اٹھالی۔

بائیک سنبھالتے ہوئے اس نے ایک لمبی گہری سانس کے ساتھ جیسے ذہن سے ساری تلخی' ساری کشیدگی اور رنجیدگی خارج کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو یکدم بجھی بجھی اور خاموش دل گرفتہ سی نظر آ رہی تھی۔

اس کا دل چاہا' وہ بے حد نرمی کے ساتھ اس کے بھیگے چہرے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے پونچھ دے۔ مگر پھر یکدم اس نے ہونٹ بھینچ کر رخ موڑ لیا اور بائیک اسٹارٹ کر دی۔

♥ ♡ ♡ ♥

دوسرے روز مریم نے خود دانیال آفریدی سے رابطہ کیا۔ وہ مریم کی بے حد عزت کرتا تھا اسے بالکل چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔

"دیکھو مریم! تمہارے' میرے یا مرتضیٰ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ندا کیا چاہتی ہے' میں نے کہا نا میرے گھر کے دروازے کھلے ہیں اس کے لیے' اگر وہ آنا چاہے تو ضرور آجائے۔ میں نے اس سے شادی کی ہے کوئی کاروباری ڈیلنگ نہیں کی' یہ گھر جتنا میرا ہے' اتنا ہی اس کا بھی ہے۔" وہ بے حد ملائمت سے بات کر رہا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"کیا آپ خود ندا کو آکر اسے منا کر نہیں لے جا

سکتے۔" وہ قدرے ڈرتے ہوئے بولی تو لحظہ بھر اس طرف خاموشی چھا گئی۔

شاید اسے مریم کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ کوئی سخت بات کہہ دیتا۔ تاہم رسان سے بولا۔

"ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے مریم۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا' یوں بھی یہ غرض کا رشتہ سمجھ لو۔ اسے دولت کی ضرورت تھی' مجھے میرے بچوں کے لیے گورنس کی۔"

اس کا انداز سفاک تھا۔

"بے شک وہ لمحے آپ دونوں کو غرض کی زنجیروں سے جکڑے تھے۔ مگر کوئی بھی دو انسان اتنا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے گزاریں تو ان کے درمیان ایک طرح کی یگانگت ہو جاتی ہے' وہ ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ دلی تعلق نہ ہونے کے باوجود ایک اعتبار کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ روز ملنے اور جدا ہونے والے لوگوں سے کہیں زیادہ ساتھ رہنے والا ساتھی قابل اعتماد ہوتا ہے اور پھر ہر شخص اپنے قریب کے درخت کی چھاؤں ہی حاصل کرتا ہے نا۔ میرے نزدیک تو انسان کی چھاؤں درخت کی چھاؤں سے کہیں زیادہ گہری اور طمانیت انگیز ہوتی ہے۔"

وہ دلائل سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ ذرا سا ہنسا۔

"یہ باتیں تم نے ندا سے کہیں۔"

"وہ تو نادان ہے۔" وہ کچھ جھینپ کر قدرے بوکھلا کر بولی۔

"وہ نادان ہے۔ حیرت ہے اور تم اس سے چھوٹی ہونے کے باوجود نادان نہیں ہو' انی وے۔" وہ اپنے جملے کی سختی اور کاٹ کو محسوس کرتے ہوئے ایک لمحے کو چپ ہو گیا پھر توقف کے بعد گہری سانس بھر کر بولا۔

"بہرحال جس طرح ہر درخت سایہ نہیں دے سکتا اس طرح کچھ انسان بھی بے سائبان ہوتے ہیں' ان کے سائبان میں چھاؤں نہیں دھوپ ہوتی ہے۔"

اس کا لہجہ بڑا روکھا اور بے اعتبار سا تھا۔

وہ افسردگی سے ریسیور کو گھورنے لگی۔

یوں بھی اعتبار زبردستی یا کسی دھمکی سے حاصل نہیں کیا جا سکتا یہ تو مقابل کی سوچ میں دھیرے دھیرے اترتا ہے جیسے ڈھلتی رات کی مدھم تاریکی میں سورج کی نرم روشن کرنیں' دھیرے دھیرے اتر کر تاریکی کا سینہ چیر دیتی ہیں۔

مگر ایسی کوئی کوشش ندا کرنے کو تیار نہیں تھی' الٹا وہ تو دانیال آفریدی کا اعتبار توڑ کر خود کو ہی مظلوم ترین ہستی سمجھ رہی تھی اور ان حالات میں خود کو ہر الزام سے بری سمجھ رہی تھی اس کا واویلا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے وہی مظلوم اور دکھی ہے۔ وہ سب سے ہی متنفر ہو بیٹھی تھی۔

مریم نے ریسیور رکھتے ہوئے سوچا کہ اسے بھی اب چپ ہو کر بیٹھ جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس کا فیصلہ وقت خود اپنے ساتھ لے کر آئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ ابھی اپنا کالج کا جرنل مکمل کر کے لیٹی تھی اور عادت کے مطابق ہلکی آواز سے ریڈیو کھول رکھا تھا تب امی کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کے پلنگ کے آخری سرے پر بیٹھ گئیں تو وہ چونکی آنکھوں سے بازو ہٹایا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے امی۔ میں تو سمجھی آپ سو رہی ہوں گی۔"

"کہاں دن میں سونا' اب تو راتوں کی بھی نیندیں اڑ گئی ہیں۔" وہ گہری سانس بھر کر پلنگ کی چادر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر خیال آنے پر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

"مریم! کچھ کہنا تھا تم سے۔"

اس نے نرمی سے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ماں ہو کر اجازت طلب کر رہی ہیں۔ کیوں شرمندہ کر رہی ہیں امی کہیے بے دھڑک کہیے۔" اس کا لہجہ تسلی آمیز تھا۔ امی نے نہال ہو کر محبت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری خالہ کئی دنوں سے کہہ رہی ہیں مرتضیٰ اور تمہارے رشتے کے لیے' مگر میں تمہاری رائے لیے بغیر کیا جواب دیتی۔"

اس کے اعصاب پر گویا بم گرا تھا' وہ گم صم رہ گئی۔ اس نے۔۔۔ کھنچے کھنچے اعصاب کے ساتھ سخت بوجھل انداز میں امی کی طرف دیکھا جنہوں نے نگاہیں ملنے پر چہرہ جھکا لیا تھا۔

"یہ کوئی معیوب بات تو نہیں ہے۔ ندا نہ سہی تم سہی اور کون سا ندا مرتضٰی کے نکاح میں تھی۔" انہوں نے سمجھانے والے انداز میں سر اٹھا کر کہا۔

"مرتضٰی میں کیا کمی ہے۔ میں تو ندا کی نادانی' کم عقلی اور اس کے جذباتی پن پر اب تک متاسف ہوں۔ مگر خیر۔" انہوں نے قدرے بوجھل سانس سینے کی تہہ سے جیسے کھینچ کر فضا کے سپرد کی تھی اور ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا جو سر جھکائے لب دانتوں میں جکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔

"کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت آپ کے لیے کیا خبر لاتا ہے۔ وقت سے خوشیاں کشید کرتے ہوئے کبھی خیال تک نہیں آتا کہ آنے والا کوئی لمحہ جھولی میں ناقابل برداشت دکھ ڈال جائے گا اور کبھی اداس ملول شامیں گزارتے ہوئے احساس تک نہیں ہوتا کہ کوئی مہکتے رنگ جیسی مسرت سے ہمکنار کردے گا۔"

مگر اس نے تو اب سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اچھا یا برا' بہت پہلے بھی جب کچھ پانے اور چاہنے کی خواہش تھی اور اب جب کچھ طلب ہی نہ رہی تھی۔

اس نے سوچا' پتا نہیں اسے امی کی بات پر دکھ ہوا ہے یا خوشی یا گہرا صدمہ یا صرف حیرت کا حملہ ہے دل پر۔

ہاں بس بہت سے آنسو آنکھوں سے یوں بہہ رہے تھے جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

امی جانے کب کمرے سے جا چکی تھیں' اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے جی بھر کر رو رہی تھی اور بہت سا رونے کے بعد کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی تب اس کا خیال ندا کی طرف گیا۔ تو ایک دکھن اور تڑپ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ سر شیشے پر ٹکا کر گہری سانس بھر کر فضا میں دھیرے دھیرے اترنے والی تاریکی کو دیکھنے اور محسوس کرنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

چاند راتوں کا ڈھب نہیں معلوم
کوئی آئے گا کب' نہیں معلوم
ہم تو وہ ہیں کہ جن کو خود اپنی
وحشتوں کا سبب نہیں معلوم

امی اب اٹھتے بیٹھتے اس سے جواب مانگتیں اور وہ الجھ کر رہ جاتی۔ کبھی انکار زبان پر مچلنے لگتا تو کبھی دل اقرار کر لینے کو چاہتا' کئی خوب صورت لمحے اس کے ذہن و دل کی سطح پر نقش تھے اور دل کے تالاب میں کنول کی مانند نرم روی سے تیرتے رہتے تھے۔ شاید ایک حجاب تھا جو اب وحشت بن کر اس پر مسلط ہو گیا تھا اور وہ اس وحشت کا سدباب چاہتی تھی۔

امی اس سے اب ناراض ہو رہی تھیں' ان کا کہنا تھا "بھلا مائیں کب اس طرح بیٹیوں کے فیصلوں کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ تو مجھے تم لوگوں کا خیال ہے ورنہ دنیا کی مائیں خود ہی فیصلے صادر کر دیتی ہیں۔"

اور وہ شرمندہ سی کمرے میں بند ہو جاتی۔

اس روز امی کی غیر موجودگی میں وہ ندا کے پاس یہ مسئلہ لے کر چلی آئی۔ اس کا خیال تھا ندا کے علم میں تو ہو گا ہی' مگر جب اس نے بتایا تو وہ نہ صرف بے خبر نکلی بلکہ کئی لمحے سناٹے کا شکار رہ گئی تھی۔

اس کی نگاہیں خالی خالی کتنی دیر مریم پر جمی رہی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ سلگنے لگیں۔ پھر ایک گہری سانس بھری اور سر جھٹک کر دوبارہ کتاب میں منہ دے دیا۔

مریم کو اس کا رویہ بڑا عجیب سا لگا۔

"ندا! کچھ کہو گی نہیں تم اس سلسلے میں۔" وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کتاب سے سر اٹھا کر اس پر ایک نظر ڈالی پھر کتاب بند کر کے اس پر ٹھوڑی ٹکا دی۔

"میں۔۔۔ میں کیا کہوں۔ کب سوچا تھا کہ مرتضٰی حسن کو اب اس روپ میں بھی دیکھنا ہو گا' اس رشتے سے بھی سوچنا ہو گا۔"

وہ ہنوز خزاں کی شام دکھائی دے رہی تھی اور پھر کتاب سے چہرا اٹھا کر بیڈ کی اونچی پشت پر ٹکا دیا۔

"اب ایک نئی اذیت سے دوچار ہونا ہو گا۔"

چلو عذاب سہیں' دوستی کے یونہی سہی
کہ وہ کسی کا ہوا' ہم کسی کے یونہی سہی

وہ تلخ سی ہنسی ہنس کر اس کے پتھرائے چہرے کو دیکھنے لگی' وہ جانتی تھی مریم بہت عقل مند اور حساس تھی۔ اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے لمبی چوڑی دلیلوں' طویل گفتگو کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ تو لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ہی کہنے والی بات کا مقصد تک جان لیا کرتی تھی۔

"تو تم آپی! تم اب بھی مرتضٰی بھائی کو۔" ندا کے پھینکے گئے پتھر سے دل میں اٹھنے والے طوفان سے کئی لمحات بعد سنبھل کر وہ بول پائی۔

"تو پھر۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔

"تو پھر ٹھکرایا کیوں تھا۔" وہ سیدھی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی' پھر یکدم اس سے نگاہیں کترا کر دیوار گیر الماری کو تکنے گئی۔ جبکہ مریم اس کی پشت پر بکھرے بالوں کے سیاہ آبشار کو کتنے لمحے کمرے میں بوجھل سناٹا طاری رہا۔ ایسا ہی سناٹا مریم کو اپنے اندر بھی اترتا' پھیلتا اور جمتا محسوس ہو رہا تھا ندا کی ہلکی ہلکی سسکیاں کمرے میں یکلخت گونج اٹھیں وہ کہہ رہی تھی۔

"وہ تمہیں کبھی کوئی خوشی نہیں دے سکے گا مریم! کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور کرتا ہے' میں اب بھی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے وہی جذبے دیکھتی ہوں اور اور وہ تم سے شادی بھی محض اسی لیے کر رہا ہے ناں کہ اس گھر میں اس کا آنا جانا ہوتا رہے اور یوں میں اس کی نگاہوں کے سامنے رہوں۔ شاید کسی اور سے شادی کے بعد وہ نہ یہاں آ سکتا اور نہ۔" فراٹے سے جھوٹ بولتے ہوئے وہ ذرا سا لڑکھڑا گئی۔ مگر مریم کا دھیان اس کے لہجے کی طرف تھا ہی کب۔ وہ تو اپنے اندر کے شور کو سن رہی تھی۔ پھر جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ندا کے الفاظ انگاروں کی طرح اس کی رگ رگ کو جھلسا رہے تھے۔ اس نے اپنے کمرے تک کا فاصلہ یوں طے کیا جیسے لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو ڈھیر ساری تھکن سمیٹ کر آئی ہو۔

پیر چھلنی ہو گئے ہوں۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں۔ ایک بے چارگی سے اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا یکدم اس کا دل چاہا وہ کمرے میں موجود ہر شے کو تہس نہس کر ڈالے جس طرح ندا کے جملوں نے اس کے اندر تک تباہی مچا ڈالی تھی۔ اسی طرح وہ ہر جگہ تباہی لے آئے۔

پھر اس نے ایسا کر بھی ڈالا۔ اپنے اختیار میں آئی ہر چیز کو اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ رائٹنگ ٹیبل پر سجی کتابیں' قلم دان' گھڑی سب فرش پر پٹخ دیں۔

پلنگ پر رکھے تکیے اٹھا کر دیوار پر دے مارے۔ گلدان سے پھول نوچ کر گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

بوتل سے منی پلانٹ کا پتا پتا نوچ لیا اور خالی بوتل فرش پر پٹخ دی۔ رنگین پانی فرش پر بکھر گیا اور اس نے وہیں بکھرے کانچ اور رنگین پانی کے پاس بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا۔

اس طرح تو نہیں سوچا تھا کبھی مرتضٰی حسن۔

"تمہیں پانے کی ایک خواہش ہمیشہ قندیل کی طرح میرے اندر جلتی رہی تھی۔ تب بھی جب تم آپی کی منزل تھے اور اب بھی جب ان کی زندگی سے نکل گئے۔

مگر اس طرح محض تمہاری مجروح روح کا نوالہ بننے کا خواب تو نہیں دیکھا تھا۔

اس کے اندر دور تک اداسی پھیل گئی۔

وہ ساری قندیلیں
سارے دیے ایک ایک کر کے بجھتے چلے گئے۔
ساری امیدوں کے رنگ اڑنے لگے۔
خواہشوں کے درخت بانجھ ہوتے دکھائی دینے لگے۔

اور اندر ہواؤں کے زناٹے دار تھپیڑے چلنے لگے۔ وہ یکدم مضمحل۔۔۔ دکھائی دینے لگی۔ یوں جیسے بالکل خالی ہو گئی ہو' شام کو اس نے امی کو فیصلہ سنا دیا کہ اسے اس رشتے سے انکار ہے اور وہ جانتی تھی امی اس فیصلے سے کس قدر دکھی ہوئی ہوں گی۔ خالہ الگ

ناراض ہوں گی اور یقیناً" یہ سوچیں گی کہ امی کی دونوں بیٹیاں کس قدر خود سر ہیں اور اس کی برسوں کی فرمانبرداری اور سعادتمندی کے تمام خطابات چھین لیے جائیں گے وہ اور ندا ایک صف میں کھڑی کردی جائیں گی۔

خالہ کا بھی قصور نہیں تھا۔ ان کے بیٹے میں کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود دوسری بار ٹھکرایا جارہا تھا۔

وہ امی کو اپنے انکار کا کوئی جواز دینے کو تیار نہیں تھی۔ بس یہ کہہ دیا تھا "پلیز مجھ سے اب تکرار نہ کی جائے۔" پھر کمرے میں جاکر آنکھوں پر بازو دھر کے لیٹ گئی اس میں امی کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ کجا وہ بہتے آنسو دیکھتی اور پونچھ سکتی۔

♥ ♡ ♡ ♥

دل ایسے شہر کے پاگل ہوجانے کے منظر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
جہاں رنگ کے سارے خس وخاشاک
سب سر صنوبر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر
کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر بنتے بنتے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے

وہ خالہ سے سامنا ہونے سے زیادہ مرتضٰی حسن سے سامنا کرنے سے کترا رہی تھی خالہ کا کیا تھا۔ بھولی بھالی خالہ نے رو دھو کر چپ سادھ لی تھی مگر۔ مرتضٰی حسن اس سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ دوبار گھر آیا مگر وہ ندا کے کمرے میں رہی۔ پھر امی سے چمٹی رہی کالج آتا مگر وہ سہیلیوں کے ہجوم کے ساتھ نکلتی اور ان کے ہمراہ کسی بھی بس میں چڑھ جاتی۔

مگر اس روز وہ اسے گھیر ہی بیٹھا۔

وہ ماموں کی طرف آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بیٹے کا عقیقہ تھا خاندان بھر کی لڑکیاں صبح سے جمع تھیں۔ خوب رونق لگی تھی۔ ندا نے تو گھر سے نکلنا ہی چھوڑ رکھا تھا۔ البتہ مریم کو آنا پڑا تھا۔ امی نے کہا تھا میں شام کو آجاؤں گی گھر کے کام نمٹا کر۔ تم صبح سے چلی جاؤ۔

ممانی کی بہن کی بیٹیاں حیدر آباد سے آئی تھیں وہ رات سے ہی آگئی تھیں۔ اور اب صبح گیارہ بجے تک ناشتہ ہی چل رہا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے گھر سے آئی تھی سو اس وقت ناشتہ سرو کر رہی تھی سب کو کہ سمن آپا کا چھوٹا بیٹا اس کے پاس آیا۔

"مریم آپا۔ آپ کو وجاہت ماموں بلا رہے ہیں باہر لان میں۔"

"خیریت... او اچھا! چائے مانگ رہے ہوں گے۔" وہ پہلے چونکی پھر مسکرا دی۔ وہ وجاہت بھائی کے شوق سے آشنا تھی۔ دو ہی شوق تھے ان کے ایک کرکٹ اور دوسرا اسٹرونگ سی چائے وہ چائے کا مگ بھر کر باہر آئی۔ مگر پورا لان ویران پڑا نظر آیا۔

"اس طرف ہیں۔" سمن آپا کا بیٹا بیٹ اٹھائے گیٹ سے باہر جاتے جاتے اسے اشارا دے گیا اور خود گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ کچھ کھٹک سی گئی۔ مگر اس سے پہلے کسی خیال پر گرفت مضبوط ہوتی کہ بادام کے پھیلے درخت کے پاس سے وجاہت کے بجائے مرتضٰی نمودار ہوا۔ جسے دیکھ کر وہ یوں سٹپٹا گئی جیسے جال میں گرفتار ہو جانے والی چڑیا جبکہ اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی وہ اطمینان سے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"یہ دھوکا دینے کی عادت کب سے اپنالی ہے۔" وہ قدرے خفگی کے ساتھ بولی اور اس پر نظر ڈال کر رخ پھیرلیا۔

"جب سے لوگ کترانے پہلو بچانے لگے ہیں۔" وہ اسی اطمینان سے بولا جو اس کے چہرے پر اس وقت نظر آرہا تھا۔ پھر چائے کا ایک گھونٹ بھر کر لذت لیتے ہوئے بولا۔

"آہا! چائے تو بڑی مزے دار ہے، لگتا ہے وجاہت بھائی کے لیے ساری محنت صرف کردی۔"

"یہ میں نے نہیں ان کی وائف نے بنائی ہے اور آپ فرمائیے کہ اس دھوکے سے مجھے بلوانے کا مقصد

۔" وہ اس کی سمت پلٹی۔ پھر نگاہیں جھکالیں۔

ایک عجیب تکلف، اجنبیت جیسے اسے اپنے اور اس کے مابین محسوس ہونے لگی تھی شاید اس کی طرف سے نئے رشتے کے استوار کرنے کی خواہش کے اظہار نے لمحوں میں ہی اس بے تکلفی کو کاٹ کر رکھ دیا تھا جو برسوں سے ان کے درمیان تھی اب ایک حجاب، ایک جھجک اور اجنبیت کی فضا چھا گئی تھی دل پر۔

"بزدل لوگوں کی طرح یہاں وہاں مجھ سے بھاگتی کیوں پھر رہی ہو تم۔" وہ چائے کا مگ گھاس پر رکھ کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"مم... میں کیوں بھاگتی پھروں گی۔ کیا مطلب ہے آپ کا اس سے۔" وہ سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر اس کے لبوں کی تراش میں بکھرنے والی مسکراہٹ نے اسے سر جھکانے پر مجبور کردیا اور یہ مجبوری اسے اپنے دل پر برچھی کی طرح لگی تھی۔

وہ جھنجھلا سی گئی۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ اور کیوں بلایا ہے مجھے یہاں۔؟"

"صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ اس انکار کی وجہ۔ خالہ بتا رہی تھیں کہ انکار تمہاری طرف سے ہوا ہے، یوں تو مجھے بھی پورا یقین ہے کہ انکار تمہاری طرف سے ہی ہوا ہے ورنہ خالہ ایسی حماقت کا ثبوت نہیں دے سکتیں۔"

"پوچھنا تو مجھے چاہیے کہ کیا سمجھ کر آپ نے مجھے پرپوز کیا تھا۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو اس بات کا، کس کی اجازت سے۔"

"ایک منٹ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ حق تو مجھے حاصل ہے تم چھیننے سے رہیں۔ بلکہ ہر شخص اپنی سوچوں، اپنے رویوں اور اپنی خواہشوں پر اختیار رکھتا ہے، تم کسی کے دل پر پابندی نہیں لگا سکتیں، کسی کی خواہش کو دبا نہیں سکتیں۔ اس کی تکمیل کے لیے اسے جائز قدم اٹھانے سے نہیں روک سکتیں اور یہ اختیار مجھے بھی حاصل ہے کہ میں اپنی ماں کو کسی بھی لڑکی کا رشتہ دینے کے لیے بھیج سکتا ہوں۔" اس نے ابرو چڑھا کر اس پر استفہامیہ نگاہ ڈالی۔

اس کی بات پر وہ ذرا سا مسکرائی اور سر ہلانے لگی۔

"ہے بالکل ہے۔ مگر مسٹر مرتضٰی حسن۔ آگے میرے اختیارات شروع ہوجاتے ہیں اور مجھے بھی یہی حق حاصل ہے کہ میں کسی بھی رشتے کو اپنے لیے پسند کروں یا مسترد کردوں سو میں نے یہ اختیار استعمال کیا ہے۔"

"مریم۔" وہ لحظہ بھر لاجواب سا ہو کر اسے ہولے سے پکار کر رہ گیا۔ پھر گہری سانس بھر کر الجھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں اس انکار کی وجہ اور سنو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر جلال سے بولا۔

"تم بھی یقیناً" پوچھنا چاہو گی کہ میرے پرپوزل بھیجنے کی وجہ تو کئی وجوہات ہیں اگر سننا چاہو تو بتاؤں۔"

اس کے لہجے اور نگاہوں میں جانے کیا تھا اس نے چہرے پر گرم گرم خون گردش کرتا محسوس کیا، وہ پلکیں جھپکا کر انگلیاں مسلتے ہوئے رخ موڑ کر بولی۔

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ بس میں نہیں کرنا چاہتی آپ سے شادی اور یوں بھی جب تک ندا آپی اپنے گھر آباد نہیں ہو جاتیں میں اس گھر میں اپنے لیے کوئی خوشی نہیں ڈھونڈنا چاہتی۔" اس کا انداز دوٹوک تھا۔

کیا پاگل پن ہے۔ یہ ندا کہاں سے آگئی بیچ میں وہ جھنجھلا کر اسے گھورنے لگا۔

"ندا ہمیشہ سے درمیان میں ہی تو ہے اور شاید رہے گی۔" اس کا لہجہ دھیما تھا اور نگاہیں درخت کے تنے پر جمی تھیں۔ پھر ایک مضمحل سی سانس بھر کر اس پر ترچھی نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"شاید وہ نہیں۔ میں درمیان میں آگئی ہوں۔ آپ کے اور اس کے درمیان۔"

"مریم! کیا مطلب ہے۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟۔" وہ گھوم کر اس کے بالکل سامنے اور قریب آگیا۔ "ندا کا

قصہ ختم ہو چکا ہے یہ تمہیں خبر ہے اس وقت ندا کا کیا ذکر۔"

"مجھے بے وقوف مت بنائیے مرتضیٰ حسن۔" وہ چیخ ہی پڑی اور اس پر سلگتی نظریں ڈال کر بولی۔

"ندا آپ کی محبت ہے اور رہے گی۔ آپ مجھے لفظوں سے بہلا نہیں سکتے' آپ چور دروازے سے اب بھی ندا کا قرب۔"

"مریم' مریم! آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔" وہ بھڑک کر چلایا مگر وہ قطعی متاثر نہ ہوئی اور مزید ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر بڑی مجروح سی نگاہ ڈال کر بولی۔

"کیوں نہ کہوں۔ کہوں گی کہ آپ مجھے محض سیڑھی بنا رہے ہیں تاکہ اس تک۔" مگر اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس نے زور سے اسے دیوار کی طرف دھکیل دیا تھا' وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔

"تم..... تم..... مریم اتنی گھٹیا۔ اتنی پست بات بھی کہہ سکتی ہو' نہیں یہ تم جیسی لڑکی کی سوچ نہیں ہو سکتی' ہرگز نہیں۔ اتنی پست خیال تم ہو ہی نہیں سکتیں۔ مریم' مریم میں یقین نہیں کر سکتا۔" وہ شدید ترین احساس ذلت سے گویا تڑپ گیا تھا' اس کی آنکھوں میں کھولن کے ساتھ تحیر آمیز بے یقینی تھی جس نے مریم کی پیشانی کو عرق ریز کر دیا۔

وہ ہونٹ کاٹتی رخ پھیرنے لگی کہ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے کندھوں پر جماتے ہوئے جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"میری طرف دیکھو۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو کہ یہ بات تمہارے ذہن میں کیونکر آئی اور یہ تمہارے ہی ذہن کی پیداوار ہے یا۔"

مریم نے گھبرا کر نظریں چرا لیں۔ اس کی آنکھوں سے کئی قطرے بے اختیار ہی پھسل پڑے۔

"ندا نے کہی ہے نا یہ بات۔ ہے نا مریم ادھر دیکھو۔" وہ اسے جھٹکا دیتے ہوئے چلایا تو اس نے گھبرا کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مگر وہ سرے پل اس کی گرفت سے تڑپتی مچھلی کی طرح نکل کر پیچھے ہٹی اور پلٹ کر تقریباً بھاگتے ہوئے لان عبور کر گئی۔

وہ ہونٹ بھینچے کشیدہ اعصاب کے ساتھ اسے بھاگتے دیکھتا رہا اسے لگا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اس کے دماغ میں ٹھوکریں مار رہا ہو اسے اپنی کنپٹیاں سلگتی محسوس ہونے لگیں۔ اور اس کھلی فضا میں بھی اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بجائے اندر جانے کے وہیں سے باہر کا رخ کیا اور بائیک نکال کر لے اڑا۔

شام کا انتظار اس نے انتہائی بے قراری سے کیا تھا' جب خالہ (امی) ماموں کی طرف چلی گئیں۔ مریم تو وہیں تھی اسے پکا یقین تھا۔ ندا تنہا گھر پر ہو گی۔

دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ اپنے سامنے مرتضیٰ کو دیکھ کر پہلے سٹپٹائی پھر جلدی سے دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے خوشگواری سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"امی اور مریم تو ماموں کی طرف گئی ہیں۔"

"ہاں' مجھے معلوم ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتا اندر آ گیا اور پیر سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ اسے بے خودی کی سی کیفیت میں دیکھے جا رہی تھی۔ ماضی سے وابستہ کچھ یادیں دھیرے دھیرے چاپ دینے لگیں۔

اسے یکدم اپنا دل کچھ معمول سے ہٹ کر دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔ اسے ماضی کے مرتضیٰ حسن کی وہ وارفتہ نگاہیں وہ معنی خیز جملے یاد آنے لگے۔ لبوں پر خود بخود مدہم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"کیسے ہو اندر آؤ۔ مجھ سے ملنے آئے ہو۔" وہ احساس تفاخر سے بولی۔

چاہے جانے کی آرزو ہر ایک کو ہوتی ہے' چاہے کسی بھی رشتے سے اسے چاہا جائے اور اس کے اندر تو کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ ہر رشتے کی محبت اور عقیدت ممنونیت کے بجائے تفاخر سے سمیٹتی آئی تھی۔ حق کی طرح وصول کرتی آئی تھی۔

جبکہ وہ۔

ہونٹ بھینچ کر اس پر ایک جلتی سلگتی نگاہ ڈال کر رہ گیا تھا۔

"میں جانتی ہوں مرتضیٰ! تم دل کے ہاتھوں مجبور ہو

کر چلے آئے ہو۔ آہ یہ محبت بڑا ہی پاگل جذبہ ہے یہ سیلاب بلا کی طرح وارد ہوتا ہے اور اپنے سامنے کسی دیوار' کسی رکاوٹ کو نہیں دیکھتا۔ اسے بھی بہا لے جاتا ہے۔" وہ آنکھوں میں خمار بھر کر اسے اپنائیت آمیز احساس کے ساتھ دیکھنے لگی۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر بولی۔

"میں کس قدر ناقدری ہوں مرتضیٰ! کہ تمہاری محبت کو ٹھکرا بیٹھی' اسی لیے تو اب اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہوں۔ تم آئے ہو تو یقین کرو ایسا لگ رہا ہے جیسے تھکی ہوئی روح کو سکون میسر آ گیا ہو۔"

وہ اپنے اندر کی کھولن پر قابو نہیں رکھ سکا اور پوری طاقت سے ایک تھپڑ اس کے دائیں رخسار پر دے مارا۔ یہ حملہ بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ وہ لڑکھڑا کر کرسی سے ٹکرائی اور تخت پر جا گری۔ پھر ہراساں ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی جہاں نفرت اور غصے کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

"میں جتنا افسوس کروں' جتنا ماتم کروں ماضی کے ان لمحوں پر جو تم سے محبت کرنے میں' تمہارے بارے میں سوچنے میں گزار دیئے اتنا ہی کم ہے' تم جیسی لڑکی کبھی میری توجہ کا مرکز رہی' کبھی میری سوچوں کا محور رہی' ان گھڑیوں پر تھوکنے کو دل چاہتا ہے۔ تم تم ندا عثمان! محبت تو کیا میری نفرت کے بھی قابل نہیں رہی ہو۔"

پہلے ہی غصے میں تھا اس کے اس عامیانہ پن نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"کیا..... کیا غلط کہا ہے میں نے' تم میرے لیے نہیں آئے۔ مجھے اب بھی نہیں چاہتے؟" وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"شٹ اپ۔" اس نے کھولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "اتنی پستی میں مت اترو ندا! کہ مجھے اس گھر اور گھر والوں کی پاکیزگی پر شک ہونے لگے۔ تم جس روز دانیال آفریدی کی بیوی بنی تھیں اس روز کے بعد میں نے تمہیں پھر کبھی اس رشتے سے نہیں دیکھا۔ چونکہ ہر رشتہ سوچ سے جنم لیتا ہے اور مجھے ہمیشہ صاف اور روشن راستہ پسند تھا۔ جو ہو گیا اسے مان لیا۔

جو میرے بخت سے نکل گیا اسے بھلا دیا۔ میں منافق نہیں ہوں' مگر جو احترام تھا آج تک' وہ بھی آج ختم ہو گیا ہے۔ تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ تم سے نفرت بھی کی جائے' تم ایک خود غرض عورت ہو' جس کے نزدیک ہمیشہ اپنی منشا اپنی غرض رہی ہے۔ تم میں اور مریم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کاش! میں مریم کو اپنانے کا فیصلہ بہت پہلے کر لیتا۔"

اس کے لہجے میں چنگاریاں بھڑک رہی تھیں جو اڑ اڑ کر گویا ندا کو اپنے جسم و جاں میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"کیوں جھوٹ بولا تم نے مریم سے۔ اتنا پست الزام لگایا تم نے میری ذات پر۔ میرا دل چاہتا ہے ندا! کہ تمہیں۔" وہ شدید ترین ملال کے احساس کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا کر رخ پھیر لیا۔

"کس کس کو دھوکا دو گی ندا! پہلے میری محبت کو فخر کے ساتھ سمیٹتی رہیں۔ پھر دانیال آفریدی کو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے دھوکا دیا۔ اس کے بن ماں کے محروم بچوں کی معصوم محبتوں سے کھیلتی رہیں۔ انہیں سیڑھی بنا کر اپنی منزل پر پہنچیں اور انہیں تپتی دھوپ میں کھلا چھوڑ دیا۔ دانیال جیسا صاف کھرا انسان۔ تمہارے اس گندے' دوغلے اور منافق وجود کو اگر اب بھی برداشت کر لے تو یہ اس کی بڑائی ہو گی۔ ورنہ تم جیسی گدھ صفت عورتوں کا انجام بہت عبرتناک ہونا چاہیے۔ تم صرف اور صرف ہر شخص کو اپنی محبت میں گرفتار دیکھنا چاہتی ہو۔

تم چاہتی ہو کہ میں ساری عمر تمہاری محبت میں زندہ درگور رہوں' تڑپتا رہوں اور تمہیں یاد کر کے آہیں بھرتا رہوں۔ یوں تمہارے محروم دل کو طمانیت ملتی رہے ایسا کرتا بھی ندا عثمان اگر..... اگر تم اس قابل ہوتیں۔ تم کسی مجبوری کے تحت مجھ سے میری محبت سے دستبردار ہوئی ہوتیں میں تاعمر تمہیں اپنے من مندر میں مورتی بنا کر شاید پوجتا مگر۔"

"چپ ہو جاؤ' پلیز چپ ہو جاؤ۔" وہ یکدم سر تھام کر چلائی اور تخت پر گر کر سسکنے لگی۔

"تم نے مریم کو مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی ۔ کیوں ندا۔ کیوں آخر؟" وہ اس کے آنسوؤں سے قطعی متاثر دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے قریب آیا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"صرف اس لیے ناں کہ تم نے اپنی ناآسودگیوں کا بدلہ لینا چاہا اس سے۔"

"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ چلے جاؤ مرتضیٰ! یہاں سے۔" وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔ "میں نے کسی سے بدلہ نہیں لینا چاہا۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا ہے۔" وہ زور زور سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارنے لگی۔ اس نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور پیچھے ہٹ کر استہزائیہ ۔ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"دیا ہے تم نے دھوکا۔ پہلے مجھے پھر ان معصوم بچوں کو' دانیال کو اور اب مریم کو۔"

وہ سچ بول رہا تھا اور یہ سچ کانٹوں کی طرح۔ کیلوں کی طرح اس کے وجود کے آرپار اتر رہا تھا۔

وہ ایک اذیت کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور بہ مشکل خود کو گھسیٹ کر کمرے میں جا کر دروازہ زور سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔

مرتضیٰ ایک گہری سانس بھر کر اس بند دروازے کو دیکھتا رہا' اس کے اندر سے ابھرنے والی سسکیوں کو کچھ دیر سنتا رہا پھر تاسف آمیز کرب سمیٹ کر وہاں سے چلا گیا۔

وہ کمرے میں بند جانے کب تک روتی رہی اور پھر بہت سا رونے کے بعد نڈھال سی اٹھی اور کولر سے ٹھنڈا پانی پیا پھر چہرہ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے فون کی طرف آئی۔

شدید ترین بے بسی کا حملہ جیسے ایک بار پھر ہوا۔ پھر سر جھٹک کر لب بھینچ کر لرزتی انگلیوں سے دانیال ہاؤس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

تیسری بیل پر ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ دانیال آفریدی کی بھاری آواز گونجی تھی۔

"میں ۔۔۔۔ میں ندا بول رہی ہوں دانیال صاحب' وہ بہ مشکل آواز کھینچ لائی تھی۔ رونے سے پہلے ہی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اب پھر آنسوؤں کا پھندا حلق میں آ پھنسا تھا۔

"مم۔۔۔ میں گھر آنا چاہتی ہوں۔" اتنا کہنے کے ساتھ ہی وہ سلگتے آنسوؤں کا بند توڑ بیٹھی۔

دوسری سمت گہرا جامد سناٹا چھا گیا' یہ سناٹا اس کے رونے سے آیا تھا یا اس خواہش پر' وہ نہ جان سکی نہ جاننے کی خواہش تھی۔

کئی لمحے بعد اس کے رونے کی شدت میں کمی آئی تو وہ بولا۔

"تم آسکتی ہو۔ میرے گھر کے دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے۔" اس کا لہجہ نہ بے تابانہ تھا نہ تمسخر اڑاتا ہوا۔ عام سا سادہ سا تھا اس کی اپنی ذات کی طرح' اس کے کردار کی طرح۔

"کیا آپ مجھے خود لینے نہیں آسکتے۔" آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے اس نے جیسے التجا کی۔

"دیکھئے پلیز' پلیز۔ میرا بھرم رکھ لیں۔" وہ اس کے کچھ بولنے سے پہلے خود ہی جلدی سے بول اٹھی "پہل تو میں نے کر ہی دی ہے نا۔ آپ کو فون کر کے۔ اب آپ کو صرف میرے دروازے تک آنا ہو گا۔ میں آپ کو اور زحمت نہیں دوں گی' ہاں اتنی زحمت اٹھانی ہو گی کہ گاڑی کا ہارن دینا ہو گا۔ آپ سن رہے ہیں نا۔"

وہ اس کی مسلسل خاموشی پر مضطرب ہو کر بولی پھر اس کے سانس کی آواز سے اس کی موجودگی محسوس کر کے دوبارہ بولی۔ "آپ کو رابعہ کا واسطہ ۔ دانیال صاحب۔"

اور ادھر دانیال آفریدی کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے سے پہلے دوبارہ بھینچ بیٹھا۔ اسے لگا جیسے اس کے اعصاب کے تنے ہوئے تاروں کو کسی نے چھیڑ دیا ہو ہر تار منتشر ہو گیا ہو۔

"او کے۔ تم نے واسطہ ہی ایسا دے دیا ہے۔" کئی لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ اسی سادہ سے لہجے میں بولا۔

"کس وقت آؤں؟" اس نے کف الٹ کر رسٹ واچ پر نگاہیں گاڑتے ہوئے پوچھا اور پھر ذرا سا رخ موڑ کر دونوں بچوں کو دیکھا جو اس کے بیڈ پر بیٹھے اپنا

ہوم ورک کر رہے تھے۔

"کل۔۔۔۔ کل شام کو میں تیار ملوں گی۔ دیکھیے آئیں گے نا آپ۔" وہ اپنی تسلی کے لیے پھر پوچھنے لگی دوسری سمت اثبات میں جواب دے کر فون رکھا جا چکا تھا۔

وہ کتنی دیر ریسیور کو گھورتی رہی پھر کریڈل پر رکھ کر اپنا سر بھی اس پر ٹکا دیا۔

صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں
جو بڑی دیر میں گھر بنتے ہیں
اور اک پل میں کھنڈر بنتے ہیں
ان در و بام میں جو لوگ تھے زندہ' وہ گئے
پر یہ آواز کے سائے نہیں' مرنے والے!
شب کی پہنائی میں کچھ کھوئے ہوئے قدموں کی
آہٹیں ڈھونڈتے رہتے نہیں مرنے والے!
کس قدر رنگ بہم ہوں تو بنے گلدستہ
ایک لمحے میں بکھر جائیں کسی بات سے وہ!
عمر بھر جاگ کے کاتیں جو ملائم ریشم
آنکھ جھپکیں تو پھسل جائے وہیں ہاتھ سے وہ
گمشدہ آگ کے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں

♥ ♡ ♡ ♥

صبح ناشتے کے دوران اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے بے تاثر لہجے میں محض اطلاع دی کہ دانیال آفریدی آج شام اسے لے جانے کے لیے آ رہا ہے' مگر یہ اطلاع امی اور مریم کے لیے کسی خوشگوار انکشاف سے کم نہ تھی۔ مریم نے کھانے سے ہاتھ روک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ خود آ رہے ہیں تمہیں لینے آپی۔" اس نے جیسے تصدیق چاہی کہ اس کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہو رہا تھا آیا وہ خوش تھی یا رنجیدہ۔

"ہاں۔" وہ کپ رکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور بیسن پر جا کر ہاتھ دھونے لگی پھر رخ موڑے موڑے ہی بولی۔

"رات کو فون کیا تھا انہوں نے کہ میں کل تیار رہوں۔"

امی نے بھی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔؟" انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھتے ہوئے اس کی شکل دیکھی۔

"فیصلہ کیا کرنا ہے۔ فیصلہ تو خود ہو چکا' جب وہ خود آ رہے ہیں تو میں انکار تو کرنے سے رہی۔" وہ کھونٹی سے تولیہ جھٹکے سے کھینچ کر ہاتھ خشک کرنے لگی۔

دو قطرے آہستگی سے آنکھوں سے پھسل کر رخساروں پر بکھر گئے تھے۔

امی بے ساختہ آگے بڑھیں اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ ان کے اندر تک گویا اس کے جملے نے طمانیت کی لہر اتار دی تھی۔ وہ کتنی دیر ان کے شفیق کندھے پر چہرہ ٹکائے کھڑی رہی۔ پھر پلٹ کر کمرے کی طرف جانے لگی تو مریم نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگی تھی۔ وہ بیک وقت مسرور بھی تھی اور افسردہ بھی۔

"محبت میں انا نہیں ہوتی آپی! یہ بات تم نے ہی کہی تھی نا ایک بار۔ تم نے بہت صحیح فیصلہ کیا ہے' رفاقت کی آمیزش ہی محبت کو مضبوط' پائیدار کرتی ہے۔ سوری۔۔۔ یہ آخری نصیحت ہے۔ اس کے بعد کبھی نہیں کروں گی۔"

وہ بے اختیار اس سے لپٹ کر رو دی' اس نے بھی اپنے دونوں بازو کھول کر عجیب بے تابانہ انداز میں اس کے گرد پھیلا کر کس لیے۔

"مجھے معاف کر دینا مریم! میں نے کبھی تمہاری نصیحتوں' تمہاری باتوں پر عمل نہیں کیا۔ خیر۔" اس نے بے حد محبت کے ساتھ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"مرتضیٰ بہت اچھا ساتھی ثابت ہو گا' دیکھو' ایک نصیحت میں کرتی ہوں۔ گو کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی تم مرتضیٰ کو قبول کر لو۔ بے غرض

محبت بہت قیمتی شے ہے جہاں سے ملے اسے سمیٹ لینا چاہیے۔ سچی محبت کی چند گھڑیاں بے اعتبار بے محبت کی رفاقت سے کہیں زیادہ اچھی اور قیمتی ہیں۔"

مریم نے اس سے نگاہیں چرالیں اور مضطرب انداز میں ہونٹ دانتوں تلے دبانے لگی۔

مرتضیٰ حسن کے دل کی مسند بہت بلند تھی مریم۔ بہت عظیم وہاں مجھ جیسی حقیر بے مایہ خود غرض عوت کا گزر کیسے ہو سکتا تھا۔ میں اس کی سچی پاکیزہ محبت کے لائق ہی نہیں تھی۔ مریم اس جگہ کے قابل صرف تم ہو۔ میں تو یونہی راہ میں آگئی تھی۔"

وہ پیار سے اس کا کندھا تھپک کر کمرے میں چلی گئی۔ شام کو دانیال آفریدی آکر اسے ساتھ لے گیا۔ اس کے جاتے ہی مریم کو یکدم پورا گھر ویران اور خالی خالی لگنے لگا۔ حالانکہ اسے دوہری خوشیاں ملی تھیں ایک ندا کے جانے کی اس کے اپنے گھر آباد ہو جانے کی اور دوسری ابو کے اب ہمیشہ پاکستان آجانے کی خبر۔

مگر ایک عجیب سی بے قراری تھی۔ ایک وحشت تھی جو دل کی دیواروں سے لپٹی وحشت زدہ کیے رکھتی۔

آج کل اس کا پروپوزل آیا ہوا تھا ابو کے دوست کے بیٹے کا۔ امی نے اس سے تذکرہ کیا تو اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا۔ شادی نہیں کرو گی تو کیا عمر بھر میرے پاس بیٹھی رہو گی۔" امی جھنجلا گئیں پھر رو پڑیں۔

"تم بھی مریم۔ تم بھی ندا کی طرح اب مجھے ستانے لگی ہو۔ تم ایسی تو نہ تھیں۔ مریم کبھی ایسی تو نہ تھیں۔ اتنی ضدی اتنی خود سر۔"

وہ بے چارگی آمیز کرب سے ہونٹ بھینچ کر وہاں سے ہٹ گئی۔

میں جسم و جاں کے تمام رشتوں سے اسے چاہتا ہوں
نہیں سمجھتا کہ ایسا کیوں ہے
نہ خال و خد کا جمال اس میں
نہ زندگی کا کمال کوئی
جو کوئی اس میں ہنر بھی ہو گا
تو مجھ کو اس کی خبر نہیں ہے
نہ جانے پھر کیوں
میں وقت کے دائروں سے باہر کسی تصور میں اڑ رہا ہوں
خیال میں خواب و خلوت میں
جلوت میں شب و روز
میرا لہو اپنی گردشوں میں اس کی تسبیح پڑھ رہا ہے
جو میری چاہت سے بے خبر ہے!

"یہ اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔" خالہ بھی نظر نہیں آرہی ہیں۔" وہ صحن کی بتیاں جلا کر اس کی طرف آیا جو صحن کے ایک گوشے میں چنبیلی کی باڑھ کے پاس بیٹھی تھی۔ اسے تو خود فضا میں اترنے والے اندھیرے کا احساس تک نہیں تھا۔ اس کی آواز اس کے اعصاب پر پتھر بن کر لگی۔ تاہم وہ یونہی بیٹھی رہی جبکہ وہ موڑھا کھینچ کر عین اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا جہاں غیر معمولی سرخی تھی ——— جیسے بہت سا رونے کے بعد آکر ٹھہر جاتی ہے۔

"یہ تمہیں اندھیرے سے کب سے محبت ہو گئی ہے۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

وہ پلکیں اٹھا کر پھر جھکا گئی تھی اور یونہی مجسمے کی طرح بے حرکت بیٹھی رہی۔

"ندا کے جانے کا دکھ ہے؟" اس نے پوچھا تو وہ گہری سانس بھر کر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"دکھ کیوں ہو گا یہ تو خوشی کی بات ہے۔ کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔" وہ الٹا اس سے پوچھ کر جانے اس کے چہرے پر کیا ڈھونڈنے لگی۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرانے لگا۔

"تم یہ سوال کسی بدگمانی کے تحت پوچھ رہی ہو یا یونہی۔ خیر تم پوچھنے کا حق رکھتی ہو بلکہ وہ سارے واہمے نکال کر رکھ دو مریم جو دل کے اندر موجود ہیں۔"

وہ یکدم اضطراب کا شکار ہو گئی اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر بولی۔

"میرے اندر کوئی واہمے نہیں ہیں نہ بدگمانیاں ہیں۔" وہ اٹھنے لگی کہ اس نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"تو پھر یہ سوگ یہ وحشت جو تمہارے چہرے پر برس رہی ہے اور خالہ بتا رہی تھیں۔ تم ایک بہت اچھے پرپوزل کو رد کر رہی ہو۔ اس بے چارے کا کیا قصور نکل آیا ہے اس سے کیا بدگمانی ہے تمہیں۔" وہ بھی اس کی کلائی پکڑے پکڑے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بدگمانی بدگمانی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے کسی سے کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ بس نہیں کرنی مجھے اس بانگڑو سے شادی۔ کوئی زبردستی ہے۔" وہ اپنی کلائی چھڑا کر جھنجلاہٹ بھرے انداز میں رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ کو نہ روک سکا تھا۔

"خیر زبردستی وہاں تو نہیں ہے۔ ہاں یہاں ہو سکتی ہے۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"مریم! اس رشتے پر کی جا سکتی ہے زبردستی۔ بات سنو۔" وہ اس کے سر پر ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"امی کہہ رہی تھیں خالہ سے کہ یہاں پر زبردستی کرنا پڑے گی اور بقول ان کے ان کے چندے آفتاب چندے مہتاب گبھرو بیٹے کو ریجیکٹ کر کے مریم بہت پچھتائے گی۔ میں نے کہا پچھتائے گی نہیں پچھتا رہی ہے۔"

"مرتضیٰ! آپ۔" اس نے جھنجلا کر اپنے سر سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے دیکھا اور جانے کیسے سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

اس کے انداز پر وہ اپنی بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو چھپانے کے لیے سر جھکا گئی۔

"ایسا گبھرو ہیرو کہاں ملے گا۔ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا گویا وہیں سے دل کا حال جان لینا چاہ رہا تھا وہ یکدم اس کی آنکھوں میں ڈھیر سے آنسو آگئے۔

"اوف۔" وہ یکدم گہری سانس بھر کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر مصنوعی بے چارگی کے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔

"یہ تم عورتوں کے پاس اتنا وافر پانی بہانے کو کہاں سے آجاتا ہے۔ چلو آپس کی بات ہے رولو تم جی کا غبار نکال لو۔ ہنس میں لیتا ہوں خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی پھر روتے میں بے اختیار ہی ہنس پڑی۔

ان آنسوؤں میں ساری بدگمانیاں ساری وحشت دھل گئی تھی بڑی تر و تازہ مسکراہٹ تھی۔

مرتضیٰ کو پورا صحن ہی نکھرا نکھرا لگنے لگا۔ وہ سینے پر بازو لپیٹ کر دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

"چائے پئیں گے آپ؟" وہ اپنے دل کی حالت سنبھالتے ہوئے اس کی محویت توڑنے کے لیے بولی۔

وہ آنکھوں میں شرارت بھر کر اسے بغور دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگا۔

"ہاں بالکل اگر چاہ کے ساتھ دو تو۔"

"چاہ آپ کو امی سے مل جائے گی۔ البتہ چائے میں دے سکتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہنسی دبا کر جلدی سے کچن کی طرف پلٹ گئی۔

یہاں کے لوگ اپنے خواب اپنے دل میں رکھتے ہیں

تمہارے شہر کی یہ اک ادا اچھی لگی ہم کو

اس پر ایک نظر ڈال کر اس نے دیوار سے پشت نکالی اور دھیمی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس روشنی کو محسوس کرنے لگا جو اسے اپنے اس فیصلے سے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔